

نفسا نے

قدرت اللہ شہاب



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

5	لے دے
11	غریب خانہ
22	شلوار
29	جگ جگ
37	کئی ہے رات تو ----
46	سب کا مالک
59	اما
65	جال
73	آیا
80	تلاش
90	دو رنگا
99	جلترنگ
106	ڈاکی
113	تین تارے
119	پہلی تنخواہ
126	صنم پلکیت
133	شینو گرافر

(اسی کو دبا چہ سمجھ لیجئے!)

لے دے

لینے دینے کے بیوپار میں یا تو بیٹے کو مہارت ہے یا ملا اور پنڈت کو دونوں کے خون میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کی رمت ہے، اگرچہ ان کا لینے والا ہاتھ ان کے دینے والے ہاتھ سے عموماً درازی مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو ایک معلق قسم کی لے دے انسانی سرشت میں گویا ازل سے موجزن ہے، اسے نہ لینے سے سروکار ہے نہ دینے سے البتہ تُو تُو میں والی گردان میں جتنی با محاورہ گفتیاں نکل سکتی ہیں، وہ بے شک اسی ایک جذبے کی محتاج ہیں۔

غالباً ہماری پہلی لے دے کا آغاز اس وقت ہوا جب اماں خوا اور باوا آدم بیک بنی و دو گوش جنت کے باغیچوں سے گول کئے گئے۔ میاں ابلیس کے ہونٹوں پر ضرور مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی، جب اس کے ٹھکرائے ہوئے خاکی مسجود کی زبان پہلی بار لذتِ ممنوعہ سے آشنا ہوئی۔ اس کے بعد گر جا گھر کی زبان میں، جب آسمانی رحمتوں کے دروازے دوبارہ کھل گئے، اور باوا آدم کے بیٹوں اور اماں خوا کی بیٹیوں نے جوق در جوق اس دنیائے فانی کو نوازا شروع کیا، تو گویا طوفانِ نوح کے نام ضرورت ہے، کا پہلا اشتہار تیار ہونے لگا۔ اب تو اللہ دے اور بندہ لے۔ یا تخت یا تختہ۔ سر سے کفن باندھ کر۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ قسم کی نازک خیالیاں عملی جامہ پانے لگیں۔ زن، زر، زمین کی آغوش میں جو روایتی لے دے کا چرچا ہے، اس نے ابال کھا کر ایک طرف تو ملک گیری کی

کوئی واہ واہ کا نعرہ لگا کر تڑپنے لگا اور جب مؤذن نے اللہ اکبر کی بانگ دی، تو شمع گل ہوئی سب نے اٹھ کر دامن جھاڑے، اور خراماں خراماں حاصلِ مشاعرہ گنگناٹے ہوئے اپنی راہ لگے۔

لیکن ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں! رفتہ رفتہ ہوا کا رخ بدلنے لگا۔ بزرگوں کو شکایت ہے، کہ جوں جوں شاعری کا جوہر کیاب ہوتا گیا شاعروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ مشاعروں کی جگہ قوالیوں کا رنگ جمہ میرزا سودا کے غنچہ اور قلمدان کی جگہ رسالوں نے سنبھالی اور غالب و ذوق کی ٹیکھی ٹیکھی نوک جھونک نے تنقیدی مقالوں کا بہروپ لیا۔ تنقید کو ذرا ثقیل قسم کی لے دے ہی سمجھئے۔ لیکن جب وہ پھٹے ہوئے لفافوں یا کھلی پٹھیموں کی صورت میں تقسیم ہونے لگے، تو یوں نظر آتا ہے جیسے وہ صیغہ تذکیر و تانیث کی رُو سے لے دے کا اسمِ مخنث ہو!

مثلاً دو شاعر دست و گریبان ہو گئے۔

ایک نے ہانک لگائی۔ ”ہونہ“ ذرا اپنا الف مقصورہ تو دیکھو! کر ہے کہ شیر می، سینہ پچکا ہوا، جیسے دے کا مریض کھانس رہا ہو!“

دوسرے صاحب بھنھنٹے ”اٹا“ مینڈکی کو بھی زکام ہوا؟ ذرا اپنی حائے خُطی کا پیٹ تو سنبھالو۔ جیسے اچھارے کا مارا ہوا بنیا ڈکاریں لے رہا ہو!“۔

تیسرے صاحب نے اس معرکہ آرائی کو دیکھا تو ان کی رگ تنقید بھی پھڑکی اور وہ اللہ کا نام لے کر دھم سے دونوں کے درمیان کود پڑے۔ ”اجی صاحب کہاں کا الف مقصورہ اور کہاں کی حائے خُطی۔ ذرا اس خاکسار کا حق، تو ملاحظہ فرمائیے۔ واللہ کس بلا کا سڈول ہے۔ اور نقطوں کی گولائی۔۔۔ خدا کی قسم قشعے ہیں قشعے۔۔۔۔۔۔“

اس بحثِ جشی میں اب ج کا اپریشن ہوتے ہوتے وہ تو بچارے لد گئے۔ لیکن اب تینوں طرف سے ہونے لگا کہ میرا شعر تیرے شعر کو۔۔۔۔۔۔ میری نظم تیری نظم کو۔۔۔۔۔۔

ہوس کو بھڑکایا، اور دوسری طرف ذہنی بغاوت کے بیج بوئے۔ پہلی صورت میں سکندر اعظم اور ہٹلر کی جماعت کے بزرگ پیدا ہوئے، دوسری صورت میں۔۔۔۔۔۔ خیر، آج کل کے افسانہ نویس ہی سہی! لیکن یہ طے ہے، کہ روزمرہ کی عامیانہ زندگی میں لے دے کی نشوونما میں جو ترقی ہوئی اس کے عمل پہلو کا سرا بلا شرکتِ غیرے دکان کے سر ہے: خواہ وہ اناج کی منڈی میں ہو، یا کوٹھوں کے بازار میں۔۔۔ اور اس کے علمی پہلو کی تربیت میں بی بھٹیاریں کا جو ہاتھ ہے اُسے تسلیم نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ دروغ برگردن راوی۔ حکایت ہے کہ سرائے میں مسافروں کی بانٹ چھانٹ میں جب کبھی ہمسایہ بھٹیاریں میں ذرا شدید قسم کا تبادلہ خیالات ہونے لگتا تھا تو انہوں نے تو تو میں میں کی فرسودہ ترکیبوں سے اگتا کر ایک تازہ سلیقہ دشنام یہ ایجاد کیا کہ میرا مسافر تیرے مسافر کو۔۔۔۔۔۔ طویلے کی بلا بندر کے سر! لیکن کھلی ڈھلی گالی گلوچ کے مقابلہ میں یہ بلا واسطہ طرزِ بیان زیادہ مقبول ہوا۔ چنانچہ اب بہ نفس نفیس لڑنے کی بجائے نواب صاحب بیڑ، اور شاعر حضرات شعر لڑانے لگے۔ خدا جنت نصیب کرے، جن دنوں مشاعروں کی دھوم دھام تھی، ادب کا معیار اپنے جوہن پر تھا۔ نو عروس کی طرح ج ج دھج کر محفل جی ہوئی ہے۔ متانت، سنجیدگی، وقار کا غلبہ ہے۔ لوگ ہمہ تن گوش دوزانوں بیٹھے ہیں۔ چہروں پر سکوت ہے، لیکن آنکھوں میں صبر شکن چٹائیاں تڑپ رہی ہیں، کہ نکلو تو میدان میں ہم بھی دیکھیں کتنے پانی میں ہو۔! بارے شمع کو گردش ہوئی ایک تلاطم سا اٹھا، اور کسی نے گرج کر مطلع داغا۔ اب کیا تھا، مصرع سے مصرع نکلنے لگا۔ ردیف سے ردیف ابھی، قافیے سے قافیہ بھڑا، مضمون سے مضمون لڑنے لگا۔ اور پلک جھپکنے میں گویا پانی پت کا تاریخی میدان سمٹ کر اس ننھی سی مجلس میں اُٹ آیا۔ نظروں کے تیر تان تان کر چھوڑے گئے۔ پلکوں کی شمشیر نے برق کی طرح کوند کر داؤ شجاعت دی کالی زلفیں زہر ناک ناگتیں بن کر لہرائیں۔ گھنگھریالے بال زنجیر بن کر پھیلے۔ کچھ بچارے قید ہوئے۔ کوئی بسمل ہوا۔ کسی نے آہ کی۔

بات میں سے بات نکلتی ہے۔ لیکن فی زمانہ اس ادبی دھینگا مستی کا سب سے بڑا اکھاڑہ وہ ادب ہے جسے سوایا اتفاقاً ترقی پسند کہا جاتا ہے تخیل اور بیان کی اس نئی روش نے زندگی کے تاریک اور گمنام پہلوؤں کو اجاگر کیا، اور مستقبل کے لئے نئی نئی شاہراہوں کا نشان دکھایا۔ اس رہنمائی میں ماضی کے جمود اور حال کے اضطراب میں ایک بے پناہ فکر لازمی تھی۔ چنانچہ نئے ادب کے دوش بدوش نئے ادیب پر بھی بے اختیار کیچڑ اچھلا۔۔۔۔۔۔ اتنی صاحب روسی پراپیگنڈا ہے، روسی! لڑچکر نہ ہوا ہسپتال ہوا، کہ جدھر دیکھو کھانسی، بخار، دمہ، سل، دروگرہ! عشق ہے تو زسوں کے ساتھ، راز و نیاز ہوتا ہے تو اپریشن کے وارڈ میں۔ واللہ دہلی کے دواخانے بھی شرما جائیں! گویا دنیا بھر میں مزدور کی ٹوکری، سڑک کوٹنے والے انجن، اور اُونچی اُونچی چیمنیوں کے سوا کچھ رہا ہی نہیں۔ چھو کری ہے تو اس کے سینہ پر کچنی ناشپاتیاں پک رہی ہیں۔ عورت ہے تو پامال۔ بہن ہے تو کسی بھوکے ننگے آرٹسٹ کے ساتھ بھاگنے پر تلی ہوئی۔ جوان بیٹی باغ کے مالی کو دیکھ کر فٹ کھا جاتی ہے۔ گیارہ بچوں کی ماں بارہویں ننھے کی فکر میں ہے۔ اور پھر ہسٹریا کا دورہ! بیویوں کو ہسٹریا، بھابیوں کو ہسٹریا۔۔۔۔۔۔ شاید بھارا ادیب بھی اسی دورے میں مبتلا ہے! اس کی بات بات میں جنسی بھوک کے انگارے تڑپتے ہیں۔ اگر وہ آرٹسٹ ہے، تو اس کا ماڈل نکا ہوتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو اس کا عریاں تخیل جسمانی آزادی کے ساتھ ساتھ قافیہ ردیف کی قید سے بھی آزادی چاہتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے، تو اس کے جوان چھو کرے گرسنہ بھیڑیوں کی طرح منہ پھاڑے جوان لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور جنسی بندشوں سے گھبرائی ہوئی عورتیں فٹ پر فٹ کھاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ پیاسے ہونٹ ڈھیلی شلواریں۔ پوشیدہ امراض۔۔۔۔۔۔ روسی پراپیگنڈا ہے، روسی!

جواب ملتا ہے، کہ حضرت آپ نے وہ شلواریں ہی کیوں پہنی جو آسانی سے ڈھلک جائے! زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ تہذیب کی کچلی بدل گئی۔

اخلاق کا معیار از سر نو تعمیر ہوا۔ بانجھوں کی جگہ کارخانے بن گئے۔ کوئل کی جگہ ریڈیو نغمہ سرائی کرنے لگے۔ تخیل کی جگہ ہوائی جہاز پرواز کرنے لگے۔ بلا خانوں کی جگہ کلب گھر نے سنبھال لی۔ حرم سرا کا رتبہ ہوٹلوں نے ہتھیا لیا۔ اور آپ ہیں کہ ”بلبل کی آنکھوں میں رگ گل کی پھانس“ تلاش فرما رہے ہیں! قبلہ دریا میں رہ کر گھر سے بچے؟ برتھ کنٹرول کا زمانہ، اور عورت کو یوں با ادب با ملاحظہ ہاتھ لگانا جیسے نماز کی تسبیح ہو!۔۔۔۔۔۔ اور پھر اس جنسی بھوک کی لت کس کو نہیں؟ آپ کی ادبی کائنات میں عورت کی ذات کے سوا اور بھی کیا؟ آپ کے چمن میں پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ وہ کسی معشوق رعنا کی بیج پر بچھائے جائیں۔ بلبل کی نغمہ سرائی میں آپ کی چیمپی مغنیہ کا سرود جھلکتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور پھر یہ وصل اور فراق کا جھگڑا کیا ہے؟ محبوب کے کوچہ میں یہ ہائے وائے کیسی؟ آپ وہاں سر کے بل جاتے ہیں۔ آنکھوں کا فرش بچھاتے ہیں۔ دیوار سے سر پھوڑتے ہیں۔ دربان کی خوشامد ہوتی ہے۔ وصل کا شربت چھٹتا ہے اور آپ خالی بوتلیں اٹھائے مارے مارے پھرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اگر سچ سچ آپ کے دل اور دماغ پر اس عورت کو پا لینے کا بھوت سوار نہیں ہے۔ جو بالاخانے کی کھڑکی میں بن ٹھن کر بیٹھی ہے یا جو حرم سرا کی چار دیواری میں ازل سے قید ہے، تو آپ کے طلسمی رنگ محل بے معنی نظر آتے ہیں۔ اور ادب کے میدان میں (بقول آپ کے) آپ کی شہسواری بیکار سی تفریح معلوم ہوتی ہے۔ عورت!۔۔۔۔۔۔ وہ آپ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ آپ کی غزلوں میں اس کا قصیدہ ہے۔ آپ کی نظموں پر وہ سوار ہے۔ وہ آپ کے تخیل میں تیرتی ہے۔ اور جب معاشرت کے اصولوں سے مجبور ہو کر وہ کھلم کھلا آپ کے ہتھے نہیں چڑھتی، تو آپ ایک اور حرکت سرزد فرماتے ہیں۔ یعنی آپ کی توجہ ساقی کلفام کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ نوخیز ساقی جس کی مسس مشکل سے بھیگی ہوں۔۔۔۔۔۔ جس کے چہرے پر سبزے کا ہلکا سا آغاز ہو۔۔۔۔۔۔ قبلہ، کیا لیتا کیا دیتا ادب ترقی پسند ہو یا غیر ترقی پسند رومان کا گوارہ

غریب خانہ

”تو چلی جا غریب خانے“ ہری بلیمہ گماشتہ نے جھکی ہوئی مونچھوں کے بال منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سک سک کر کسے دکھا رہی ہے سالی؟“

”شام تک پھر سوچ لے۔“ گماشتہ نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مونچھیں سنہال کر دوبارہ کہا۔ ”تیرے باپ کی جگہ ہوں سالی۔ پتھر کے بھگوان تو بھوگ مانگتے ہیں۔ ہمارا بھگوان ساری عمر کے لئے نہال کر دے، ہاں!“ اور جاتے جاتے ہری بلیمہ نے چہرے کی بناوٹ سے ہنسنے کی کوشش کی۔ کچنی پکی مونچھوں میں اس کے تین کالے کالے، پیلے پیلے دانت ڈمکاتے سے نظر آئے جیسے دھوئیں سے تھٹی ہوئی بھڑیں اپنے چہتے میں دم توڑ رہی ہوں۔

کامنی کو ان سسکتی ہوئی بھڑوں میں بڑا زہر نظر آتا تھا۔ اور وہ ہری بلیمہ گماشتہ کی ہنسی دیکھ کر سسم جاتی تھی۔ جب وہ باپو سے لگان کا تقاضا کرنے آتا۔ تو یہی گھناؤنی مسکراہٹ ان گندی گندی گالیوں کا راستہ صاف کرتی تھی جنہیں سن کر کامنی کی ماں شرم کے بوجھ سے جھکتی جاتی اور باپو زور زور سے کھانسنے لگتا۔ گماشتہ کی گرجتی ہوئی آواز کو دھیمہ کرنے کی کوشش کرتا۔ بیگار کے روز تو وہ مونچھیں اور بھی جھکتیں اور بھی گرتیں اور اس کی بھڑیں کچھ زیادہ پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ دم توڑنے کی کوشش کرتیں۔ کیونکہ ہری بلیمہ کے ہاتھ چہتے کی جگہ لائن کے ساتھ زیادہ مصروف رہتے۔۔۔۔ اور پھر ایک دن جب کامنی نے دیکھا

ہوتا ہے۔ آپ اپنے رومان کو زندگی سے نوچ کر ایک دماغی خلا میں لے جاتے ہیں۔ نئے ادیب کا رومان گلیوں کے کٹڑ پر ہوتا ہے، مزدوروں کی بارکوں میں، پہاڑی چشموں کے پاس، میونسپل کمیٹی کے ٹل پر، ریل کے ڈبے میں، گھر کی چار دیواری کے اندر۔۔۔۔۔۔ کیونکہ اس کے آگے اور پیچھے زندگی کی انتھک مشین چلتی رہتی ہے۔ ہٹاتی ہوئی، بگاڑتی ہوئی، کچلتی ہوئی۔۔۔ آپ کے عاشق اور معشوق جنوں اور پریوں کی بستی سے اترتے ہیں، یا محلوں کی سیج پر اُگتے ہیں یا خوابوں کی ٹھنڈی دنیا میں بستے ہیں۔ اس کا عاشق دن بھر دفتر میں کام کرتا ہے یا کارخانے کی چیمیاں صاف کرتا ہے یا ہوٹل میں جاکر شراب پیتا ہے۔ اس کی محبوبہ ایک شریف زادی ہوتی ہے، کہ جس کے تخیل کو دہلی ہوئی خواہشوں نے آوارہ کر دیا ہو۔ یا ایک مایوس جوانی کہ جس کی قسمت ایک بہت بوڑھے یا بہت موٹے، یا انجور سے مرد کے ساتھ ٹانگ دی ہو۔۔۔۔۔۔ یا پھر وہ ایک سستی سی بجھتی ہوئی شمع ہوتی ہے۔ جسے خود آپ کے اصول ہر روز نئی محفل میں بھڑکنے کے لئے مجبور کرتے ہوں۔۔۔۔۔۔ آپ اپنے ہیرو اور ہیروئن کی شادی رچا کر انہیں جملہ عروسی میں دھکیل دیتے ہیں، اور واپس آ کر نو مہینے کے بعد بچے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب جملہ عروسی کے پردے گرا کر واپس نہیں آ جاتا۔ وہ خلوت خانوں کے چور دروازے تلاش کرتا ہے اور دبے پاؤں پس پردہ کے رموز ٹٹولتا ہے۔ بارہا اس نے دیکھا، کہ نودمیدہ غنچے بیدردی کے ساتھ کسی پھٹی پرانی، بوسیدہ جھولی میں پھینک دیئے گئے ہیں۔ ایک ہلدی اور نمک کا سوداگر کسی روشن دماغ حواس لڑکی کو گود میں لئے بازار کے بھاؤ سنا رہا ہے۔ کوئی آرٹسٹ نوجوان ایک بچے پیدا کرنے والی مشین کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔۔۔۔۔۔ یہ زندگی کی ستم ظریفیاں ہیں۔ آپ انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب ان کا پیچھا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔

لیکن چھوڑیئے جناب، کہاں کی بات کہاں جا پڑی۔ نہ کسی کے لینے میں

نہ دینے میں!

کہ اس کی چھوٹی سے جھونپڑی میں اتنا بڑا غلا ہو گیا ہے۔ جتنا کہ آسمان کی افقی وسعتوں کو سمیٹ کر بھی نہ ہو سکے۔ تو اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹے ہوئے جالے کے ایک تار سے لٹکی ہوئی مکڑی کی طرح اس بے پایاں غلا میں لٹک رہی ہے۔ اکیلی بے سہارا بے آواز۔۔۔۔۔۔ اور اس وقت ہری بلمہ گماشتہ نے زبان گھما گھما کر اپنے منہ میں سوئی ہوئی بھڑوں کو جھنجھایا، اور کامنی کے ہاتھ میں بھگوان کے سہارے کی ڈور تھما دی۔۔۔ ”رونے سے کیا ہو گا بچی؟ باپو گیا، مینا گئی، بھینا گیا۔ سبھی جاتے ہیں، کامنی۔ کون رہا ہے، اور کون رہے گا۔ سدا نام بھگوان کا۔۔۔۔۔۔ چل، تیرے باپ کی جگہ ہوں۔ سوشیل ٹھاکر کے پاس رکھوا دوں گا سالی، پتھر کے بھگوان تو بھوک مارتے ہیں۔ ہمارا بھگوان۔۔۔۔۔۔“

اکیلی بے سہارا بے آواز۔۔۔۔۔۔ کامنی نے سہارے کی ڈور کو تھام لیا سوشیل ٹھاکر بھگوان تھے۔ انہوں نے کھینچا۔ ہری بلمہ گماشتہ کے بھگوان نہیں، آٹھ گاؤں کے رکتہ بند، سند یافتہ آن داتا۔۔۔۔۔۔ انہوں نے ڈور کو کھینچا۔۔۔۔۔۔ جھٹکے سے، پیار سے، غصے سے، ہولے ہولے، تیز تیز۔ وہ دیوداسی تھی، کھینچتی آئی، آنکھیں موندے، بھرم لگائے پچارن کی طرح جو من کی لو سے موہ مایا کا جال کانتی ہوئی بڑھتی جائے۔۔۔۔۔۔ مایا کا جال! آنکھوں پر پردہ ہی تو ہے، موہ کا۔ مایا کا۔۔۔۔۔۔ اور بچپن میں کامنی کے کان کتنی ہی بار اٹٹھٹھے گئے تھے، اور اس کی بانہوں پر شہتوت کی چھڑیاں شاک شاک برسا کرتی تھیں۔ جب وہ پانٹھ سالہ میں گیتا کے اشلوک بھول جایا کرتی تھی! پنڈت جی کی لمبی سی چھڑی، ہوا میں دائرے بنا کر گھوما کرتی۔۔۔۔۔۔ آنکھوں پر پردہ ہے مورکھ، موہ کا، مایا کا، پردہ اٹھا اور درشن پایا۔۔۔۔۔۔ پنڈت جی اونچی اونچی لے میں پڑھاتے۔ اور پھر چھڑی ہاتھ سے رکھ کر اپنی ران کھلانے لگتے۔ اور پوپے منہ سے گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح گایا کرتے۔۔۔۔۔۔ گھونگٹ کے پٹ کھول ری، تو ہے پیا ملیں گے۔۔۔۔۔۔ گھونگٹ۔ ہاں رے۔ ہاں جی۔ گھونگٹ کے پٹ کھول ری۔۔۔۔۔۔

اکیلی، بے سہارا بے آواز۔۔۔۔۔۔ وہ ڈور میں مچھلی کی طرح اٹکی ہوئی جا رہی تھی۔ منسل کا دوسرا سرا بھگوان کے ہاتھ میں تھا۔ ہری بلمہ گماشتہ کے بھگوان آٹھ گاؤں کے بھگوان، کامنی کے بھگوان۔۔۔۔۔۔ اور ایک روز جو زور کا جھٹکا لگا۔ تو جیسے سارے جال ٹوٹ گئے ہوں۔ سارے پردے ہٹ گئے ہوں۔۔۔۔۔۔ کیونکہ اس نے دیکھا تو سوشیل ٹھاکر ننگے کھڑے تھے۔۔۔۔۔۔ بالکل ننگے، جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے نکل کر آئے ہوں۔ بڑبڑاتے ہوئے، بگڑے بھینے کی طرح ڈکارتے ہوئے، اور اُن کے منہ سے ایک تیز تیز سڑاندھ نکل رہی تھی۔ جو ہر سانس کے ساتھ کمرے میں منتشر ہوتی جاتی تھی۔ کامنی گھبرائی، تڑپی اور ایک جھٹکے سے اپنے سہارے کا پھندا توڑ تاز کر بھاگ گئی۔۔۔۔۔۔ چھی چھی چھی۔۔۔۔۔۔ اُسے گھن آ رہی تھی، جیسے آسمان کے کسی سوراخ سے اس نے دیوتاؤں کو گندگی کھاتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ اور جھونپڑی میں آتے ہی سب سے پہلے اس نے تلسی کا پودا کٹاک سے توڑ ڈالا۔ اور چبوترے پر رکھے ہوئے بھگوان کو ہوا میں زور سے گھما کر پچھواڑے کے تلاب میں دے مارا۔۔۔۔۔۔ غٹ، غٹ، غٹ، تلاب میں بلبلے اُٹھے، اور ٹوٹ گئے۔ کامنی کو سکون سا ہوا کہ اب مایا کے پردے پر گدلے پانی کا ایک موٹا سا غلاف بھی چڑھ گیا ہے۔

”میں نے کہا تو کتیا ہے، کتیا۔“ ہری بلمہ گماشتہ نے لاشی زمین پر مار کے کہا۔ چار دن سے بھوکی بلک رہی ہے، تجھے کاٹنا ہے سوشیل ٹھاکر کا گھر؟ چل اُٹھ، پھر سے لگوا دوں گا، ہاں۔۔۔۔۔۔ باپ کی جگہ ہوں سالی۔

”نہیں چاچا۔“ کامنی نے منت سے کہا۔ ”میں وہاں نہ جاؤں گی۔“

”تو پھر کہاں جائے گی بڑی رانی؟“

”غریب خانے۔“

”تو چلی جا غریب خانے۔“ ہری بلمہ گماشتہ نے جھکی ہوئی مونچھوں کے بال منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سسک سسک کر کسے دکھا رہی ہے

تھی۔ سہمی ہوئی سی دیرانیاں جو ان کی زندگی کے راستے میں خون آشام بھیڑیوں کی طرح دانت نکالے کھڑی تھیں۔ بچوں کو دیکھ کر کامنی کا دل تڑپ اٹھا، اور اس کا جی چاہا کہ وہ ان تمام معصوم مجسموں کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لے، اور بھیج بھیج کر کہے۔۔۔۔۔ میری جان، تم کائنات کی دیرانیوں میں اڑتے ہوئے آوارہ ذرے ہو۔ جن کو نہ زمین نگلتی ہے نہ آسمان سنبھالتا ہے۔ تم آکر میرے سینے سے چمٹ جاؤ۔۔۔۔۔

ان کے علاوہ پوتر ہوس میں آٹھ دس جوان عورتیں تھیں۔ جن کے کپڑے ذرا صاف تھے، چروں پر رونق، آنکھوں میں چمک۔۔۔۔۔ جیسے اجڑے ہوئے قبرستان میں کلیوں کے بوٹے اُگے ہوئے ہوں! ان میں بیٹا تھی، مائو، بستھی، رحمن، فروزاں، شاموٹی۔۔۔۔۔ اور ایسی ہی بدنصیب جوانیاں جن کا اُجڑا ہوا حسن ان چڑھاوے کے پھولوں کی طرح تھا جو قبر کے سرہانے پڑے پڑے مرجھا گئے ہوں۔۔۔۔۔ شاید اس چار دیواری میں آنے سے پہلے ہی ان کے سنبھالے ہوئے آگینے چھلک چکے تھے۔ شاید وہ کسی اذلی انصاف کے ترازو میں ٹل چکی تھیں۔ اور قدرت کے کسی درندہ قانون نے ان کے جسم کو چار چھانک چاول کی قیمت پر چکا دیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن جب وہ غریب خانہ میں داخل ہو گئیں، تو گویا ان کی زندگی کے چور دروازے اپنے آپ کھل گئے۔ اور اب ان راستوں سے نئی نئی دھوتیاں، خوشبودار صابن کی نکلیاں، سسکتے ہوئے، ریگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کے حصوں سے چرائے ہوئے گلو کوس ڈی کے ڈبے، وٹامن بی کے قرص، کاڈلور آئل، سسے ہوئے بچوں کے منہ سے جھنی ہوئی دال، کبھی دودھ، کبھی سپرمنڈنٹ کے دفتر کی چائے، کبھی ڈاکٹر کی الماریوں کے پیچھے رکھے ہوئے مصری کے کوزے۔۔۔۔۔ ان کھلے ہوئے دروازوں سے یہ چھوٹی چھوٹی عورتیں ان کی زندگی میں داخل ہو رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور چھوٹے چھوٹے رومان بھی! جو رات کی تاریکی میں غریب خانے کی فضا پر زبردستی چھا جانے کی کوشش کرتے۔ جس طرح قبرستان کے احاطے میں دلہا دلہن کی برات

ڈاکڑ نے بھی ٹیسٹ کیا۔ ”فٹ ہے!“ دونوں مسکرائے۔ اور جب کامنی نے غریب خانے میں قدم رکھا تو اس کی دائیں پسلیوں میں ڈاکڑ کے انگوٹھے کے دباؤ سے ابھی تک درد ہو رہا تھا۔ پہلے اس کا جی چاہا کہ بھاگ جائے۔ لیکن پھر اس کی نظر بیٹا پر پڑی، جو مٹی کا ایک گندہ سا پیالہ اٹھائے اس کی طرف بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔۔۔۔۔ ”تم آگئی ہو، کامنی؟“ بیٹا کے منہ پر خوشی کا جوار بھانا سا آیا کیونکہ چار مہینے پہلے وہ بھی اسی طرح آئی تھی۔ لیکن اس کے پاس پرچی تھی۔ جو سوشل ٹھاکر نے دی تھی۔ بیٹا کے ہاتھ میں بھی ہری بلمہ گماشتہ نے سہارے کی ایک ڈور لا کر دے دی تھی۔ لیکن وہ ایک سیدھی سی لڑکی تھی۔ بے حس نہیں۔ ایک سیدھی سی عام سی لڑکی جس کے شعوری احساسات پیٹ کی ٹکر کھا کر چور ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ اور جب سہارے کی ڈور اسے کھینچتی ہوئی مجاز کے پردوں کے پیچھے لے گئی۔ تو بچاری کو کچھ بھی عجیب نظر نہ آیا۔ کیونکہ اس کے دماغ میں سوشل ٹھاکر نے کبھی دیوتا کا روپ نہیں لیا تھا۔ ”تُو نے سوشل ٹھاکر سے پرچی نہ مانگی، کامنی؟“ اس نے پوچھا۔ ”وہ تو جھٹ سے دے دیتے۔ آؤ! ادھر ہمارے پاس بیٹھو۔“

کامنی کا۔۔۔۔۔ ہٹا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے گردن مروڑ کر اُسے ایک اندھیرے غار میں دھکیل دیا ہے، جس میں بھیانک بھیانک، ڈراؤنی ڈراؤنی روہیں ایک دوسرے پر چڑھی بیٹھی ہیں۔ غریب خانے میں چار سو پچاس روہیں تھیں۔ ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگوں والے ہڈیوں کے ڈھانچے۔ سسکتے ہوئے آدمی۔۔۔۔۔ سُکھی ہوئی لگتی ہوئی چھاتیوں والی، ریگتے والی بوڑھی عورتیں جن کے بال ان کی ہڈیوں کی طرح سوکھ کر جھڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ بیشمار چھوٹے چھوٹے بچے جن کے پیٹ پھولے ہوئے تھے اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں، ان کے دلوں میں ایک نامعلوم ارتعاش تھا۔ ایک چھپی ہوئی کپکپاہٹ جو ڈراؤنا خواب دیکھ کر رگ رگ میں لرزنے لگتی ہے۔ لیکن زبان پر نہیں آتی۔۔۔۔۔ ان کی معصوم آنکھوں میں ایک اچنتی ہوئی سی وحشت

رہی تھی، بچوں کے غول آپس میں لڑ رہے تھے۔ اور نیم جان ہڈیوں کے ڈھانچے کسی برقی قوت سے بیدار ہو کر چیلوں کی طرح بھوپن باورچی پر جھپٹ رہے تھے۔

”ادھر آ جاؤ، اس طرف۔“ بھوپن باورچی نے سر اٹھا کر کامنی کو آواز دی۔ اور اپنے کندھے کا رومال اُتار کر پاس والی جگہ جھاڑنے لگا۔

کامنی چلتے ہوئے لرزتی تھی، اس کے بدن میں چھوٹے چھوٹے سانپ سے ریگ رہے تھے۔ کبھی کسی بڑھیا کی سوکھی ہوئی چھاتی اس کے ہاتھوں سے چھو جاتی، اور کبھی کوئی ہانپتا ہوا بوڑھا بے تحاشا اُس کے کندھوں پر گر کے دم سیدھا کرنے لگتا۔ اور پھر اچانک اُس کے پاؤں پر جیسے اُبلتا ہوا پانی گر پڑا ہو۔ اور ایک خوفناک سی بڑھیا نے اس کی ٹاک پکڑ کر منہ پر زور سے چاٹنا مارا۔ اندھی ہے رائنڈ؟ ”بڑھیا کڑکی۔“ ”دال گرا دی باپ کی کتیا نے۔۔۔۔۔۔“ اور جب تک کامنی بھوپن باورچی کے پاس نہ جا بیٹھی۔ وہ بڑھیا غضبناک آنکھوں سے اس کا پیچھا کرتی رہی۔

بھوپن نے اُسے بہت سے چاول دیئے بہت سی دال، اور جب وہ کھا چکی تو اس نے نوکرے کے نیچے سے دودھ کا پیالہ بڑھایا۔ اور کہا ”اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چپکے چپکے پی لینا۔“ اور پھر گلوکوس ڈی کی ایک مٹھی بھی کانڈ میں پیٹ کر کامنی کو دی۔ ”یہ شکر ہے۔“ بھوپن نے ہونٹوں سے چُسن چُسن کرتے ہوئے کہا ”ولانتی ہے ولانتی!“ اور اپنا ہاتھ پونچھنے کے لئے کامنی کی پیٹھ پر رگڑنے لگا۔

”اری ادھر سے جا۔“ مینا نے کامنی کو دھکیل کر کہا۔ ”کسی نے دیکھ لیا تو شور مچ جائے گا۔ یہ کلموے کسی کو کھاتے ہوئے دیکھ کر سارتے نہیں۔“ مینا نے پڑ پڑ کرتی ہوئی آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن کامنی کے نکلنے سے پہلے ہی بچوں کے ایک غول بیابانی نے اسے گھیر لیا، اور۔ ”دودھ۔ دودھ“ کے ہٹے کے ساتھ اس کی ٹانگوں، باہوں، کمر

کھڑی ہو کر باجہ بجانے لگے۔۔۔۔ اور شاید یہی وجہ تھی، کہ رات کے وقت جب سکتے ہوئے کراہتے ہوئے، ڈھانچے زندگی کے لق و دق صحرا میں آخری کنارے کا کھوج لگانے کے لئے ترپنے لگتے، اور جب ننھے ننھے بچے خواب میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی جھنجھٹاتی ہوئی کھوپڑیاں دیکھ کر چیخ چیخ اُٹھتے، تو اس وقت یکایک پرنٹنڈنٹ صاحب کو اپنے ادھورے رجسٹر کا فارم پُر کرنا یاد آتا۔ اور وہ مینا کو اپنے دفتر میں بلا لیتے۔ ڈاکٹر کو گلوکوس کے ڈبے اور کونین کی شیشیاں الماری میں سجانے کے لئے فروزاں کی فوری ضرورت محسوس ہوتی۔ گلزار حسین سقے کے مشینزے میں سرشام ہی چھید ہو جاتے اور ہسنتی کو ٹانگے لگانے کے لئے جاتا ہی ہوتا۔ مائو اپنا آنچل سنبھال کر بھوپن باورچی کے برتن منہوانے جاتی۔ سکھو مہتر کا ٹوٹا ہوا جھاڑو رحمن کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ اور شامولی کو غریب خانے کی حفاظت اتنی پیاری ہوتی کہ وہ ادھی ادھی رات گئے گیٹ کپڑے کو ہشیار کرنے جایا کرتی۔۔۔۔ اور اسی طرح غریب خانے کی بہت سی میناؤں، ہسنتیوں اور شامولیوں نے اپنے اپنے سہارے کی لڑیاں تھام رکھی تھیں۔ اور ان کی زندگی کے چور دروازوں سے اُبلی ہوئی دال اور چاول کے ساتھ ساتھ نئی نئی دھوتیاں، صابن کی ٹکلیاں، اور گلوکوس، ڈی، کی مٹھاس بھی رس رس کر آنے لگی تھی!

”کیا سوچتی ہو، کامنی؟“ مینا نے اسے بلا کر کہا۔ ”بابو پوچھتے ہیں رجسٹر میں نام لکھوا دیا تو نے؟“

کامنی چونکی۔ پرنٹنڈنٹ صاحب عینک ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ ”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”داخلہ پھر ہو جائے گا۔ بچاری بھوکی ہے۔ لیجاؤ لنگر میں مینا۔ نام ہو گیا ہے۔“

گلزار حسین سقے نے مسکرا کر ایک مٹی کی تھالی اور پیالہ اُسے دیا۔ مائو کو لنگر میں جاتے ہی ایک دھکا لگا۔ ایک مدھم سے چراغ کی روشنی میں غریب خانے کی ساری آبادی مٹی کے پیالوں اور تھالیوں پر جھکی ہوئی پڑ پڑ کھا

”اندرھی!“

شلوار

”شلوار؟“ رشیدہ نے میز پر مگمار کے کہا۔ ”کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے؟ نہ سمجھ، نہ بوجھ بس ہلا دی بالشت بھر کی زبان، اور لگے افلاطون کے کان کاٹنے۔۔۔۔۔۔“

نسیم بے توجہی سے مسکرایا۔ اس نے سگرٹ کا دھواں گھما گھما کر منہ سے نکالا۔ ”وہ دیکھو بھابی، میں نے کیا اچھے رنگ، بنائے ہیں!“

”اُلو۔“ رشیدہ غصے سے بولی۔ ”میں شلوار کی بات کرتی ہوں اور تم رنگ، بنا بنا کر۔۔۔۔۔۔“

”اچھا، بابا، اچھا۔ بتاؤ کیا کریں شلوار کو؟“

”اپنے سر سے باندھ کر ناچو، اور کیا؟ بد تمیز کہیں کے۔ جو منہ میں آیا بک دیتے ہو۔ نہ موقع نہ لحاظ، نہ شرم۔ اگر وہ برامان جائے تو؟“

”خدا کی قسم!“ نسیم شرارت سے مسکرایا۔ ”بڑا مزا آئے! میں نے اسی کو ستانے کے لئے تو کہا تھا، بھابی!“

”بس یہی کرتب سیکھنا تم۔ جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہو توں توں عقل گھٹتی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔“

اور پھر یکایک نسیم کو خیال آیا، کہ شاید جمیلہ نے سچ بچ بڑا مان لیا ہو! آہا ضرور چڑ گئی ہوگی! اسی لئے تو وہ سر جھکائے سن سے باہر نکل گئی۔ اس کے گال ضرور لال ہو گئے ہوں گے، اور اس کے کانوں کے پیچھے نادم سی گرماہٹ پھیلی

ہوگی۔ جیسی تو وہ سرسراتی ہوئی نکل بھاگی۔ ورنہ وہ اسے دیکھ کر ٹھہرتی، نہکتی، جھکتی، جاتے ہوئے قدم قدم پر گھومتی اور جیسے بچاری کو یک نخت ساری بھولی ہوئی باتیں یاد آگئی ہوں۔۔۔۔۔۔ ”بھابی میری اُون ضرور بھیجنا۔“ ”ہاں بھابی دیکھو، ہلکے عنابی رنگ کی ہو۔۔۔۔۔۔“ اوئی اللہ، بھابھی نے اپنی نئی چوڑیاں تو دکھائی ہی نہیں۔۔۔۔۔۔ ”کبھی چوڑیاں دیکھنے کبھی سلاخیاں اٹھانے، کبھی جھوٹ موٹ کی باتیں دہرانے وہ جاتی، لوٹی، گھومتی اور نہ جانے کیوں ایک بیٹھا سے ارتعاش اس کے سینے میں کپکپانے لگتا، اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی سی تھماہٹ دھک اُٹھتی اور اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔ یا اللہ، اس کی بھیگی بھیگی نظریں کس طرح صابن کے رنگ برنگ بلبلوں کی طرح ہوا میں تیرتیں۔۔۔۔۔۔ اور نسیم کو یوں محسوس ہوتا کہ اس کا خون سگرٹ کے دھوئیں کی طرح رنگ بناتا ہوا اہل رہا ہے، اور وہ چور چور سی آنکھیں اس کا ایکسرے کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

”جمیلہ ضرور چڑ گئی ہوگی! شبنم کی طرح حناں تو ہی۔۔۔۔۔۔ بھلا چڑتی کیوں نہ؟“ نسیم نے بھابھی کو جھنجھوڑا۔ ”میں کتا ہوں بھابھی، اس نے بڑا تو مانا ہو گا!“

”چل بھٹیاریہ۔“ بھابی نے میز پر سے چائے کی پیالیاں اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔ ”شرم تو نہیں آئی ہوگی، ابھی؟“

”شرم؟ ارے واہ!“ بھابھی کی جھنجھلاہٹ پر نسیم ہنسنے لگا۔۔۔۔۔۔ اور ہنستا گیا یہ اس کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو ہنسنے ہی جاتا۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔

ہی ہی ہی سفید سفید دانتوں کی بتیسی ہے کہ نکلتی آرہی ہے، دونوں رخساروں پر یہ یہ گہرے گول گول گڑھے چل اُٹھتے، اور جب تک بھابی جھپاک سے چکھے کی ڈنڈی اس کے حلق تک نہ لے جاتی، وہ بند نہ ہوتا۔ جمیلہ پر تو نظر پڑتے ہی اس کا دل گد گد آنے لگتا، اور وہ زور زور سے چلاتا۔ ”بھابی، بھابی، لانا ڈنڈی! یہ پڑا دورہ۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔۔۔“

نہ جانے کیوں، بھابی کو دورے کے نام سے وحشت تھی۔ سخت ہی بلہا

پھلیاں اٹھاتے ہوئے چوری چوری جیلہ کی طرف دیکھتا۔۔۔ دیکھا بھابی میں نہ کھتا تھا، وہ گلابی جار جٹ نہ لو۔۔۔۔۔ رنگ کچا ہے!“

”اے ہے، کچا نہ کچا۔“ بھابی اپنے گلابی جار جٹ کی قمیض پر دونوں ہاتھ پھیرتی ”چار دھو دھل چکی ہے، لیکن ویسی کی ویسی تو پڑی ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں، جی دیکھ لو، کچا ہے، جیلہ کے منہ پر کتنا لگ گیا ہے۔۔۔۔۔“

ہی ہی ہی۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔“ وہ پھول سے دانت کھلتے، قمیضوں کی آندھی سے چلتی، بھابی کے بچکے کی ڈنڈی ہوا میں بلند ہوتی۔۔۔۔۔ اور جیلہ اپنے تہمتاتے ہوئے بھبھوکا سے گالوں کو کہنیوں میں چھپائے بھاگتی، جاتی، پھر رکتی، جھکتی، لوٹتی، گھومتی۔۔۔۔۔ اور اس کو بہت سی بھولی ہوئی باتیں یاد آ جاتیں، اپنی اُون، بھابی کی چوڑیاں۔۔۔۔۔ اور پھر وہ ڈیوڑھی پر لگی ہوئی موٹی سی ہنسی اٹھا کر چلی جاتی، جیسے آسمان کی رنگیلی پتنگیں شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو جائیں!

نسیم کے دل میں طرح طرح کے ہوائی قلعے بنا کرتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا، کہ جیلہ ریشم کے پتلے پتلے دھاگوں میں بندھی ہوئی پتنگ کی طرح آسمانوں میں اڑتی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ اُونچی اُونچی، ستاروں کے جھرمٹ پھاندتی ہوئی۔۔۔۔۔ اور پھر وہ چاند کی پیشانی پر ایک سترنگے قشقے کی طرح جا بیٹھی۔۔۔۔۔!! یا، جب وہ ککشاں کی دودھیلی کیاریوں کو دیکھتا، تو اس کے دل میں بے باک سی، باغیانہ سی جھلکیاں آنے لگتیں۔۔۔۔۔ جیسے جیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلی قمیض نے ککشاں کے ایک بکھرے ہوئے آوارہ سے ٹکڑے کو اپنے دامن میں چھپا رکھا ہو! بادلوں والی رات اُسے ایک بھیانک اور منموس سا خواب نظر آتی۔۔۔۔۔ وہ جھنجھلا کر اپنے انگلیاں چبانے لگتا، کہ اس کا پسینہ تو وہ بادلوں کی چادر کو نوچ کر تار تار کر ڈالے جس نے ککشاں کی لطیف سلونوں پر گھنے گھنے سائے ڈال رکھے ہیں۔۔۔۔۔ اور نہ جانے کیوں۔۔۔۔۔ اُسے جیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلے مورا کہین کی قمیض پر فحشہ آنے لگتا۔۔۔۔۔ اور وہ دالان میں کھڑا ہو کر

اُٹھتی ”اللہ نہ کرے کسی کو دورہ پڑے۔ میری توبہ، نسیم تیرے منہ میں لگام بھی تو نہیں۔“ نسیم کھل کھل کر مچلتا رہتا۔ جیلہ بیٹھے بیٹھے سڑکتی سی جاتی اس کا رنگ خواہ مخواہ قرمزی سا ہونے لگتا، اور نسیم کا جی تلملانا کہ وہ اس گداری سی گٹھڑی کو ربڑ کی گیند کی طرح دبا کر پچکا دے! گیند؟ ارے معاذ اللہ۔۔۔۔۔ جیلہ کا چھریا بدن شہتوت کی ٹہنیوں کی طرح جھومتی ہوئی نازک بانہیں، لمبی لمبی ناچتی ہوئی سی ٹانگیں، چھم چھم تھرکنے والے سڈول پاؤں۔۔۔۔۔ جس دن وہ چوڑے چوڑے پانچوں والی کاسنی شلوار، نیلے مورا کہین کا پھولدار پھنسا پھنسا کرتا، اور گلابی ریشم کا سرسراتا ہوا دوپٹہ پہن آتی، تو نسیم کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں اور وہ جھپ جھپ پلکیں مار کر دروازے کے پردوں کے پیچھے کھسکتا جاتا۔۔۔۔۔ ”اُو میری پھلجھڑی!“ بھابی ہنس کر کہا کرتی۔۔۔۔۔ ”اونسوں۔“ جیلہ گلابی ہونٹ ہنورتی۔ ”پہلے شہرات تو آنے دو، بھابی!“ نسیم پردوں کو بانہوں پر لپیٹ کر گھومتا، اور انجان بن کر زور زور سے پوچھتا۔۔۔۔۔ ”شہرات آگئی، بھابی؟ اور حلوا؟“

”شہرات بھی آئے گی، بھئی۔ ابھی تو پھلجھڑی آئی ہے!“ بھابی شرارت سے کہتی۔ جیلہ شرما کر اپنا سر بھابی کی گود میں چھپا دیتی۔

نسیم خواہ مخواہ انجان بنتا۔ ”آہ، بھابی۔ پھلجھڑی کیا، ہم تو اتار لیں گے، اتار۔۔۔۔۔ چم چم کرتے ہوئے انگارہ سے اتار! پٹانے۔۔۔۔۔ گلابی گلابی، کاسنی کاسنی، نیلے نیلے کانغدوں میں لپٹے ہوئے پٹانے۔۔۔۔۔ جو دل کی دنیا ہلا کر رکھ دیں۔۔۔۔۔ اور پھر بھابی کی ناک کی طرح تیز تیز کیلی چھپھوندیں۔۔۔۔۔“

بھابی زور زور سے ہنستی اور اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک اور دوسرا بچکے کی ڈنڈی پر جا پڑتا! جیلہ سڑکتی سڑکتی بھابی کی گود میں دھنستی جاتی، دھنستی جاتی، اور پھر بھابی اس قوس قزح کے ٹکڑے کو دھکیل کر پیڑھی پر بٹھا دیتی۔ ”اب ہٹ بھی جیلہ پاگل کہیں کی!“

نسیم جھک کر بھابی کے سامنے رکھی ہوئی نوکری میں سے مٹروں کی

چاہتا کہ بھابی بچھے کی ڈنڈی زور سے اس کے حلق میں مار دے۔۔۔۔۔

ایک روز وہ مچھلی کے شکار کو گیا۔ ندی کانٹوں پانی ہلکی ہلکی لہروں میں جھٹک رہا تھا۔۔۔۔۔ چھوٹی چھوٹی، ابھی ہوئی سی لہریں۔۔۔۔۔ سفید گلاب کا ایک بڑا سا پھول ان کے ہموں میں تیز تیز جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ڈگمگاتا ہوا، تھرتھاتا ہوا، کبھی وہ مچلتی ہوئی لہروں کے زیرِ دم میں ڈوبتا، کبھی اچھلتا، پھر ڈوبتا، پھر اچھلتا۔۔۔۔۔ اور نسیم کا جی بے اختیار اُکسا کہ وہ دھم سے پانی میں کود پڑے، اور اس تیز رفتار پھول کو جھپٹ کر روک لے۔۔۔۔۔ جو جیلہ کی گول گول، سفید ایزدی کی طرح بھاگتا ہوا، جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ہائے جیلہ کی ایزدیاں! جب وہ اپنا متملایا ہوا چہرہ کنیوں میں چھپائے ڈیوڑھی کی حق کی طرف بھاگا کرتی تو نسیم چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی گول گول سڈول ایزدوں کا تعاقب کرتا، جن پر کاسنی شلوار کے آبشاری پانیچے اور گردابی بل کبھی گرتے کبھی اٹھتے کبھی اٹھتے، کبھی گرتے۔۔۔۔۔

اور پھر آخر شبرات آئی! بھابی عورتوں کی مجلس میں گئی ہوئی تھی۔ نسیم کمرے میں بیٹھا پٹانے لگا رہا تھا۔ اتنے میں پھلجھڑی آگئی! رنگین شراروں کی نرج چم چم کرتی اور دالان میں کھڑی ہو گئی۔

”بھابی، یہ لو چھپھوندریں!“ اس نے ہلکی سی ہنسی دبا کر کہا۔

نسیم چونکا۔ ”اوہو، پھل جھڑی ہے؟ ذرا پٹاخوں سے بچ کے رہنا!“

”میں تو بھابی کو پوچھتی ہوں۔“ جیلہ نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔

”بھابی نہیں ہے۔“ نسیم خرگوش کی طرح بھاگتا ہوا آیا، اور مٹھی بھر

اپنے زمین پر مار کے بولا۔۔۔۔۔ ”یہ گئے پٹانے! اب باری ہے پھلجھڑی کی!“

جیلہ شرما کر بھاگی، ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی۔۔۔۔۔ نسیم بھاگا۔ غصہ،

غصہ غصہ۔۔۔۔۔ پٹانے پھوٹ رہے تھے۔ جھرر رر۔۔۔۔۔ جیلہ کا پاؤں

شلوار کے پانیچے میں الجھا اور وہ دھڑام سے گری۔۔۔۔۔ نسیم نے لپک کر سنبھالا،

اور بانسوں پر اٹھا لیا۔۔۔۔۔ اتار، شرارے!! آگ!!! دونوں کھو سے گئے، جس

طرح آتش بازی کے شعلوں میں دھو آں کھو جائے۔۔۔۔۔ اور ایک دودھیاسی بے باک ٹانگ ہوا میں ناچنے لگی، جیسے قوس قزح کی لڑیوں سے کشمکش کا دھارا پھوٹ نکلے! اور پھر وہ جاگی، جھجکی، گھبرائی۔۔۔۔۔ اور بے اختیار بھاگی۔ اس کا پھنا ہوا پانیچہ پیچھے پیچھے گھسٹنے لگا۔۔۔۔۔ جس طرح پھلجھڑی کے ساتھ ساتھ چھپھوندری بھاگ رہی ہو!

دوسرے روز وہ آئی، تو سفید بوسکی کا سیدھا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ بھابی دیکھتے ہی چلائی۔۔۔۔۔ ”اے ہے۔۔۔۔۔ جی، یہ کیا لڑکاسی بن گئی ہو؟ شلوار کیا ہوئی؟“

جیلہ کا منہ گرما گیا۔ ”کل پاؤں الجھا تو پھٹ گئی۔ میں بھی تو دھڑام سے گری بھابی۔۔۔۔۔ اب سب کے گلوڑے پانیچے چھوٹے کروانے دے دیئے ہیں۔“

”توبہ، چوٹ تو نہیں آئی؟“ بھابی نے پوچھا۔

”بہت ہلکی سی!“ جیلہ نے ایک چھپے ہوئے سرور کی جھرجھری لے کر کہا۔ اور پھر وہ یکایک جھینسی۔ اور بات ٹالنے کے لئے بولی۔ ”کل کا جلسہ کیا رہا بھابی؟“

”بڑے مزے کا۔ عیم غیاث نے اچھا خطبہ دیا۔ تم کیوں نہ آئیں؟“

”یونہی رہ گئی۔۔۔۔۔ خطبے میں کیا کہا؟“

”بہت سی باتیں۔ شبرات کی فضیلت اور جانے کیا کیا؟ توبہ، سب کچھ یاد بھی تو نہیں رہتا۔۔۔۔۔“

”بھابی، شبِ برأت میں فرشتے اترتے ہیں؟“ نسیم نے پردے کے پیچھے

سے منہ نکال کر پوچھا۔

”اللہ میاں کی رحمت ہے بھینا۔ فرشتے تو آتے ہی ہیں۔“ بھابی نے

ایک قسم کی روحانی سنجیدگی سے کہا۔

”اور خوریں، بھابی؟“ جیلہ نے آنکھیں جھکا کر شرارتا پوچھا۔

جگ جگ

”جگ جگ، حضور؟“ سفید داڑھی والے بیرے نے کافی کی پیالی میز سے اٹھا کر پوچھا۔

افضل نے کہا۔ ”لے آؤ۔“ کلکتہ میں آتے ہی ٹرام میں اس نے کسی کو پہلی بار جگ جگ کہتے سنا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ ڈم ڈم یا بج بج کی طرح کسی جگہ کا نام ہو گا اب رات کے کھانے پر جب ہوٹل کے بیرے نے پوچھا ”سُوپ، حضور؟“ تو افضل نے کہا، لے آؤ۔“ کٹلس حضور؟۔۔۔۔۔ لے آؤ! سلطانہ پڈنگ، حضور؟۔ لے آؤ!۔۔۔۔۔ جگ جگ حضور؟۔۔۔۔۔ لے آؤ! افضل نے سوچا کوئی چینی مٹھائی ہوگی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ شاید شراب ہو۔ اس خیال سے اس کے روگنوں میں کچکی سی ہوئی۔ کیونکہ وہ ابھی شراب کو منہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش بھی نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کے لئے اس نے زندگی میں خاص خاص منزلیں بتا رکھی تھیں۔ مثلاً سگرٹ۔۔۔۔۔ کالج میں وہ کئی بار سگرٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل کو اس نے ایم۔ اے پاس کرنے تک اٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ اب وہ چار مہینے سے سگرٹ بھی پیتا تھا، اور جی بھر کر پیتا تھا۔ اس کی زندگی کی شاہراہ میں اگلی منزل کا نشان قدسیہ تھی۔ قدسیہ کا بام یہی کوئی دو چار ہاتھ دور تھا۔ کیونکہ وہ اس کی منگیتر تھی۔ اور اگلے مہینے کی دس تاریخ کو رواجاً اس کی ملکیت میں آنے والی تھی۔ انسان کی تعمیر میں کچھ پوشیدہ رگیں ایسی بھی ہیں، جو آرزوئے ملکیت پر بے اختیار پھڑک اٹھتی ہیں۔ افضل کے پاس روپیہ تھا، اور جب بنک کی پاس

”ہاں ہاں، ضرور!“ نسیم چلایا۔ ”لیکن پھٹی ہوئی شلواریوں والی۔۔۔۔۔“

جیلہ کے گالوں پر گلابی ڈورے آئے، اور وہ پانی کے ریلے کی طرح پھل کر بھاگ گئی۔

”توبہ، ایسی بات بھی کوئی کہتا ہے بھلا؟“ بھابی نے چائے کی پیالی کھٹ سے پرچ میں رکھ کر کہا۔

”میں نے کوئی اُسے کہا تھا کچھ؟ شلوار کی بات تھی!“

”پہل چپ رہ۔ بڑھا ہو گیا ہے، اور بات کی تیز نہیں۔۔۔۔۔“

”تو میں کیا کروں بھابی؟ یہ لباس ہی بد تیز ہے!“ نسیم نے بات ٹالی۔

بھابی کو بھی غصہ آگیا۔

”شلوار؟“ اس نے میز پر مٹکا مار کے کہا۔ ”کبھی دیکھا بھی ہے تم نے

کسی کو شلوار پہنے۔۔۔۔۔“

ہوئی ہے جب وہ قدسیہ کو پالے گا تو سمجھے گا کہ دنیا کے ساتھ اس کا ایک ضروری حساب بے باق ہو گیا ہے۔ یعنی سارے جہان کی عورتوں میں اس کے جیسے کا جو نکڑا تھا، وہ اسے مل گیا۔ افضل نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اسے حق ہو گیا تھا کہ ایک خاص عمر پر پہنچ کے وہ دنیا سے اپنے جیسے کی عورت مانگ لے۔ چونکہ وہ اتفاق سے مسلمان گھر میں پیدا ہوا تھا، اس لئے دو چار عورتیں بھی مانگ سکتا تھا۔۔۔۔۔

ہوٹل کا ڈائینگ روم کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ تیز تیز برقی قمقمے جگمگ جگمگ جل رہے تھے۔ افضل کے سامنے والی میز پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور ایک جوان عورت بیٹھے ہوئے آکس کریم کھا رہے تھے۔ ایک بیڑا بھانے بھانے جھک کر میز کے نیچے نظر دوڑاتا تھا۔ ادھیڑ عمر والے آدمی کے گھٹنے جوان عورت کے گھٹنوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور ان کے پاؤں ایک خاموش تال پر تاج رہے تھے۔۔۔۔۔ بائیں طرف ایک بھڑکیلی سی لڑکی بناؤ سنگار کئے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میلے کپڑوں والا لڑکا تھا۔ ان کے سامنے چائے کی پیالیاں تھیں۔ لیکن وہ نہ تو چائے پیتے تھے۔ نہ آپس میں بولتے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھیں۔ یکایک افضل کی نگاہیں لڑکی سے ملیں۔ وہ جھینپ گئی۔ افضل نے پھر دیکھا۔ وہ مسکرا پڑی، اور اس کے سفید دانتوں کی لڑی سرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی طرح جگمگا اٹھی۔ وہ دیر تک کن آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ پھر وہ میلے کپڑوں والا لڑکا کسی بھانے اٹھ کر چلا گیا۔ لڑکی نے گول گول آنکھیں گھما کر خالی کرسی کو دیکھا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی کو تچچے سے مدھم مدھم مڑ میں بجانا شروع کیا۔ اس جلت رنگ کی آواز افضل کو اپنی طرف بلانے لگی۔ لیکن اس نے تو گاؤں کی سنسان گلیوں میں بھی کسی اکیلی لڑکی کو کھلے طور پر گھورا نہیں تھا۔ اب اس بھرے ہوئے ہال میں وہ اس اجنبی لڑکی کے ساتھ کیسے جا بیٹھتا؟ اس کے دل میں ایک عجیب سا اضطراب ہونے لگا جس میں غصہ تھا، مایوسی

بک پکار کر کہتی تھی کہ میاں افضل! یہ سب روپیہ تمہارا ہے، محض تمہارا۔۔۔۔۔ تو اسے ایک خفیہ تسکین ہوتی تھی۔ اور وہ لمحہ بھر کے لئے جعلی دستخط بنانے والوں کو بھی بھول جاتا تھا! لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں جب اس نے ایک چھوٹی سی خوشنما کو بھی بنوائی، تو اس کی پیشانی پر بڑے بڑے حرفوں میں ”افضل کدہ“ لکھوایا گیا۔ اوپر انگریزی میں، نیچے اردو میں۔ جب کوئی راغبگر اچانک اس ٹام کو پڑھ کر گزر جاتا تھا تو شاید افضل کی کوئی خاموش رگ مطمئن ہو جاتی تھی، کہ شکر ہے گزرنے والے کو یہ دھوکا نہیں لگا کہ شاید یہ خوبصورت مکان کریم بخش کا ہو۔ یا طوطا رام کا۔۔۔۔۔

اب اگلے مہینے اس کی ملکیتی جائیداد میں قدسیہ کا چلتا ہوا چھریا جسم بھی شامل ہونے والا تھا۔ قدسیہ کو پالنے کے بعد افضل کے ارض و سما ایک دھندلی سی افقی لکیر میں کھو جاتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ وہ انارکلی میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دکان کھول لے گا۔ کبھی اس کا تخیل قدسیہ کو لیکر تاج محل اور اجنٹا آرٹ کی سیاحت کے لئے چل نکلتا تھا۔ بسا اوقات اس کے تصور میں ارغوانی لہروں والے چمچاتے ہوئے پیگ گھوم جاتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ اصل میں قدسیہ کے بعد افضل کی تمناؤں پر رنگ سالگ جاتا تھا۔ اور اسے خود محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس کی زندگی اس گرم گرم دیکتے دیکتے ہوئے کونے کی طرح رہ جائے گی۔ جسے پانی میں ڈال کر چھن سے بچھا دیا ہو۔۔۔۔۔ افضل آوارہ مزاج نہیں تھا۔ وہ آسودہ مزاج تھا۔ آسودگی ساحل کے کنارے بیٹھ کر لہریں گنتی ہے۔ آوارگی ان لہروں کی آغوش میں کود جاتی ہے۔ چنانچہ جب افضل کو معاہدہ خیال آیا کہ شاید جگمگ کسی شراب کا نام ہو، تو وہ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی شراب پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لائحہ عمل میں شراب کی منزل عورت کے بعد تھی۔ عورت کا وجود قدسیہ کا وجود تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی کائنات میں عورت کا روپ یا تو ماں کا روپ ہوتا ہے، یا بہن کا یا بیوی کا۔۔۔۔۔ وہ عورت کو ایک سترگی پیگ نہیں سمجھتا تھا۔ جو انسان کی زندگی پر قوس قزح کی طرح تنی

رکشاؤں میں جک جک تھی، گھوڑا گاڑیوں میں جک جک تھی۔۔۔۔۔ وہ سرسراتی ہوئی خوبصورت ساریوں میں تھی۔ اس نے رنگ برنگ فراق پہنے ہوئے تھے وہ عظیم الشان کمروں میں تھی۔ وہ خوشنما پردوں کے پیچھے تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی تھی، جو کچھ تھی۔۔۔۔۔ ٹوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح تھی۔ جس کی ایک پھانک تراش کر اسے خفیہ طور پر ننگا کر دیا ہوا!

وہ ایک لدی ہوئی ٹرام میں پھنس کر کھڑا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک نازک سی لڑکی تھی، جس کے تراشے ہوئے بال پھولوں کی طرح منک رہے تھے۔ جب ٹرام رکتی تھی، تو ہر ہچکولے کے ساتھ اس لڑکی کا سارا بوجھ الفضل کے کندھوں پر آگرتا تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے عطروں میں بسا ہوا ریشم کا تھان اس پر ڈال دیا ہو۔۔۔۔۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا، کہ ٹرام قدم قدم پر رکے، اسے گام گام پر ٹھوکریں لگیں، اور پھر وہ کسی دوسری ٹرام سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔۔۔۔۔ جیسے تارے ٹوٹتے ہیں! لیکن دعا منوانے کے لئے بھی ہمت درکار ہے۔ ٹرام گڑگڑاتی بھاگی جا رہی تھی۔ ایک تند خو نوجوان کھسکتا ہوا آگے بڑھا، اور ان دونوں کے درمیان ٹکس کر کھڑا ہو گیا۔ اب الفضل کو شاید پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہچکولے لگنے کے لئے ضروری نہیں کہ ٹرام کو جگہ جگہ رکن پڑے!

”نان سنس“ اس لڑکی نے غصے سے نوجوان کو ڈانٹا۔

”جک جک!“ نوجوان نے اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کے کہا۔

”جک جک!“ وہ مسکرا پڑی۔۔۔۔۔

عین اس وقت الفضل کو سفید داڑھی والا بیڑا یاد آ گیا۔ اور پھر وہ بھڑکی لڑکی جو چائے کی پیالی پر چچہ مار کر جلتنگ بجارہی تھی۔۔۔۔۔ لیکن پھر اچانک اسے قدسیہ یاد آ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک زبردست گالی دی۔ وہ کلکتے میں شادی کا سامان خریدنے آیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ ہر راہ چلتی عورت کے قدموں میں پامال ہو جائے۔ اس نے جیب سے چیزوں کی

فہرست نکالی، اور ایک بہت بڑی دو منزلہ دکان میں چلا گیا۔

یہ دکان کلکتے کی بڑی دکانوں میں سے تھی۔ اس میں مختلف چیزوں کے لئے الگ الگ سکشن تھے۔ ہر سکشن میں گاہکوں کی مدد کے لئے آدمی یا عورتیں مامور تھیں۔ سینٹری والے حصے میں ایک خریدار کاؤنٹر پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت جس کے چہرے پر جھریوں کی پہلی لہر اٹھنے والی تھی، بڑی مستعدی سے چیزیں نکال کر لا رہی تھی۔ رائٹنگ پیڈ، لفافے، سیاہی۔۔۔۔۔ اور پھر خریدار نے ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب کہا۔ ”جک جک!“ عورت کے سنجیدہ چہرے میں کچھ تبدیلی ہوئی۔ اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر مسکرا پڑی۔

ایک خوبصورت اور جوان جوڑا سنگار کی الماریوں کے پاس گھوم رہا تھا وہ دھیمی دھیمی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اور ان کی بے تاب آنکھیں ایک دوسرے کو اپنی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو رہی تھیں۔ تین بے باک چھوکرے سگرٹ پیٹے ان کے پاس سے گذرے۔ انہوں نے بنی ٹھنی ہوئی دلہن کو گھور کر دیکھا۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور سگرٹ کا دھواں زور زور سے موم کے ان رنگین مجسموں پر چھوڑنے لگے۔ جو نمائشی ساڑھیاں، گاؤن اور فرائز پہنے کھڑے تھے۔

ان مجسموں کے اعضاء، اقلیدس کی شکلوں کی طرح متناسب تھے۔ ان کے انداز میں دنیا بھر کی رعنائیوں کو منجمد کر دیا گیا تھا۔ اگر کوئی آرٹسٹ ان کے بدن میں تھوڑا سا لوچ، تھوڑی سی حرارت ڈال سکتا تو یقیناً گاؤنوں اور فرائزوں اور ساڑھیوں کے ساتھ وہ بھی منگے داموں بک جاتے! الفضل ایک مجسمے کے سامنے کھڑا ہو گیا، جس نے سلفے ستارے والی آسمانی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے رنگین رخساروں کو دیکھتا رہا اور پھر ساڑھی دیکھنے کے بہانے اس نے مجسمے کی ٹھوس کمر کو زور سے دبا دیا اس کے دل میں ایک زبردست خواہش ابھری کہ وہ لپک کر اس موم کی مورت سے لپٹ جائے اور اس کے کانوں

کٹی ہے رات تو-----

”اوہو، آپ کو اعتراض ہے؟ معاف-----“ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ اور پھر کپار ٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کر کے یک لخت چپ ہو گئی۔

”جی نہیں۔ لیکن----- شاید آپ کو تکلیف----- خیر-----“

میں نے ناول بند کر دیا۔ اور برتھ سے اٹھ کر ہکلاتے ہوئے کمر شروع کیا۔ ہکلاتا میری عادت نہیں۔ لیکن جب یکایک کوئی خوبصورت عورت میرے سامنے یوں آ جائے جیسے آسمان سے ٹوٹا ہوا تارا گر پڑا ہو، تو مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ وحشت نہیں، ایک گوناگوں کیفیت کہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اے شعلہ جوالہ! ذرا سنبھل کے۔ تیرے سامنے پروانہ بھی ہے، جو جل جائیگا۔-----

شعلہ جوالہ! ہائے، یہ لفظ یاد آتے ہی میرے دائیں گل پر ایک ہلکا سا تھپڑ لگتا۔ کل جب ہم سب لوگ ہمایوں کے مقبرے کی طرف پک پک پر گئے، تو پرانے قلعے کی ایک ٹوٹی ہوئی خندق سے اُلھ کر حمیدہ زور سے ہوا میں اچھلی۔ اور اگر میں نے اُسے بڑھ کر سنبھال نہ لیا ہوتا، تو غالباً وہ مُنہ کے بل گر جاتی۔ اور اس کی جیکھی ناک کے ساتھ جو ایک مصوّرانہ تخیل وابستہ ہے، ضرور چُٹنا جاتا۔

”اوئی اللہ! مجھے چھوڑیے۔“ اس نے میری گرفت سے نکلنے کی ایک محلفانہ کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں اس کے گل دیکھ کر جل سا گیا، جو لال لال انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اے شعلہ

میں چیخ چیخ کر کہے۔ ”جک جک، جک جک، جک جک-----“

”کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟“ عقب سے ایک جوان چھو کری نے پوچھا۔ افضل اچک کر ایک طرف ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی فراق والے مجتھے میں یکایک جان پڑ گئی ہے۔

”جی ہاں، مجھے کچھ ساڑھیاں چاہئیں، کچھ فراق-----“ اس نے جلدی جلدی جواب دیا۔ گھبراہٹ میں وہ اور کوئی بات نہ بتا سکا۔

وہ لڑکی اسے ایک تلوے کمرے میں لے گئی۔ اور الماریاں کھول کر قسم قسم کی ساڑھیاں نکالنے لگی۔ افضل کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ وہ ساڑھیوں کی جگہ فراق والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے شرارت سے مُنہ پھلایا۔ اور پھر ایک ملائم سی ریشمی ساڑھی کے نیچے ان کی انگلیاں اچانک مل گئیں۔ وقت کی رفتار لمحہ بھر کے لئے تھم گئی۔ افضل کے دل کی گمراہیوں سے جک جک کا لفظ ایک مستانہ ترنم کے ساتھ ابھرا، لیکن گلے تک آ کے اٹک گیا جیسے ناچتی ہوئی رقصہ کا پاؤں دھم سے اگلدا ان میں پھنس جائے۔----- اس نے جلدی جلدی ساڑھیوں کا پلندا سنبھالا اور باہر نکل آیا۔

سڑک کے کنارے ایک خالی رکشا والا پتے سے لگا اوٹھ رہا تھا۔ افضل اچک کر اس میں سوار ہو گیا رکشا والا ہر بڑا کر اُٹھ بیٹھا، اور نیم خوابی کی حالت میں بولا۔

”کہاں چلیں گے حضور؟ دھرم تلے؟“

”حرامزادہ۔“ افضل کڑک کر بولا۔ ”دھرم تلے میں تیری ماں ہے سالے؟“ رکشا والے نے ایک زور کی جمائی لی۔ وہ ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح رکشا میں جُست گیا۔ اب اس کی نیند بھی دور ہو گئی تھی۔

”جک جک، حضور؟“ اس نے رکشا کھینچتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں سالے ہاں۔“ افضل دوبارہ کڑکا۔ جک جک ماں نہیں ہے، جک جک بہن نہیں ہے، جک جک بیوی نہیں ہے۔۔۔۔۔ تو کیا جک جک سانپ ہے؟

وہ اپنے ڈرپوک ضمیر سے لڑتا جا رہا تھا!

ہولی۔ اور پھر دروازے کی چٹخی اندر سے بند کر کے یک لخت چپ ہو گئی۔
اعتراض؟ ارے، معاذ اللہ کون کافر اس گنلو بے لذت کا بار اٹھاتا۔ میں
نے سوچا، چلو گھڑی دو گھڑی کے لئے رتلیٹی محفل کا سامان ہوا۔ کہاں روز روز
ایسے رومان ہاتھ آتے ہیں۔ کہ رات کا سناٹا ہو۔ ریل کی ٹھٹ ٹھٹ گڑ گڑ عمر
رواں کی طرح لمبی لمبی مسافتوں کو دامن میں لپیٹتی ہوئی بھاگی جا رہی ہو۔ ڈبے
میں امریکی کرٹل بے ہوش سویا ہوا ہو۔۔۔۔۔ عین اس وقت جوان رعنائیوں
سے چھلکتی ہوئی ایک حسین عورت یوں آجائے، جیسے راہ چلتے مسافر کی جھولی
میں پتے ہوئے انگوروں کا خوشہ ٹپک پڑا ہو۔۔۔۔۔ اور پھر ڈبے میں کوئی خالی
برتھ بھی نہ ہو!

وہ اپنا آؤنی اور کوٹ اُتار رہی تھی۔ میں نے کوٹ تھام کر کھونٹی پر لٹکا
دیا۔ ”شکریہ“۔ اس نے بھیگی بھیگی سی مترنم آواز میں کہا۔ آسانی ریشم کی لہراتی
ہوئی ساڑھی میں وہ ایک مرمریں مجسمے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ یا یوں کہئے،
کہ چودھویں کے چاند کا عکس کسی گرتی ہوئی آبشار کی نیلاہٹوں میں ہو لے
ہو لے رقص کر رہا تھا۔

”ہوا کتنی سرد ہے۔“ میں نے کھڑکیوں کی جھللیاں بند کرتے ہوئے
کہا ”آپ کے ساتھ اور کوئی سامان نہیں کیا؟“

”جی نہیں۔“ وہ اپنا چھوٹا سا چرمی بیگ گود میں ڈال کر میرے بڑے
ٹرنک پر بیٹھ گئی۔ ”زندگی کا بوجھ خود کیا کم ہے؟“ اس نے آہستہ سے زیر لب
کہا۔ ”یہ گراں بار زندگی!“ اس نے ایک آہ سی بھری۔

”اوہو، آپ ٹرنک پر کیوں بیٹھی ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”یہ برتھ جو خالی
ہے“

”جی نہیں شکریہ۔ میں آپ کو تکلیف نہ دوں گی۔“

”اخواہ تکلیف کیسی؟ برتھ آپ کا ہے۔ شوق سے استعمال کیجئے۔“

”آپ اصرار نہ کریں۔ میں بہت آرام سے ہوں۔“

جواہر!“ اور حمیدہ نے سب کی آنکھ بچا کر میرے منہ پر ناز سے ہلکا سا طمانچہ
مارا۔

وہ حمیدہ کی بات تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کے ناز اٹھانے کی مشق
تھی۔ لیکن اس وقت جو خوبصورت خاتون یک بیک میرے سامنے آ کر کھڑی
ہو گئی اس کے تجاہل عارفانہ اور ایک نمایاں سے عالم استغراق نے مجھے ہکھلانے
پر مجبور کر دیا۔

ہمارے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں صرف دو نشستیں تھیں۔ اوپر والی
سیٹ پر ایک امریکی کرٹل لیٹے ہوئے تھے۔ نچلے برتھ پر میرا بستر تھا۔ دہلی سے
چل کر کچھ دیر تو ہم دونوں مدرانہ سی بحثوں میں اُلجھے رہے، جن کے دوران
میں بہت سی حکومتوں کے نیچے اوجھڑے۔ بہت سی قوموں کے چاک گر بیان سی
دیئے گئے۔۔۔۔۔ اور کوئی رات کے دس بجے کے قریب جب ہم غالباً ساری دنیا
کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا چکے، تو کرٹل صاحب اچک کر اپنے برتھ پر چڑھ گئے اور
اپنی نیند کے چمن میں اُونچے اُونچے خراٹوں کا ارغنون بجانے لگے۔ کچھ ایسی
بات ہے، کہ چلتی گاڑی میں مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ شاید بچپن میں مجھے
پنگوڑوں کے جھولے نصیب نہیں ہوئے۔ چنانچہ میں نے وقت کٹی کا سامان کیا،
اور ڈی۔ ایچ لارنس کی ایک ترقی یافتہ کتاب نکال کے رکھ لی!

طوفان ایکسپریس رات کے ستائے میں فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔
امریکی کرٹل کسی بھیانک خواب سے متاثر ہو کر خراٹوں میں شدید قسم کی گولہ
باری کر رہے تھے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی لیڈی چیزلے جوانی کے سمن زاروں
میں۔۔۔۔۔ خیر۔ جب ٹرین علی گڑھ کے اسٹیشن پر جا کے رکی، تو یکایک ایک
رتکین رخساروں والی بھڑکی عورت بجلی کی طرح کوند کر ہمارے ڈبے میں
داخل ہوئی۔ میری آنکھیں خیرہ سی ہو گئیں۔ منہ کھل سا گیا۔ اور ماننا پڑے گا
کہ میں کچھ بوکھلا کر اٹھا بیٹھا۔

”اوہو، آپ کو اعتراض ہے؟ معاف۔۔۔۔۔۔۔“ وہ میری طرف دیکھ کر

”آپ کو کچھ پریشانی ہے؟“

”پریشانی؟۔۔۔۔۔جی! یہ تو زندگی کا دوسرا نام ہے۔“

”بہت خوب!“ میں نے ذرا شوخی سے کہا۔ ”اگر آپ مصور نہیں تو

شاعر ضرور ہیں!“

وہ مسکرائی۔ ”جی شاید۔ اپنا اپنا خیال ہے۔۔۔۔۔خیر۔۔۔۔۔“

”آپ بہت افسردہ ہیں۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔ ”اگر آپ کا سفر

لبا ہو، تو آرام سے سو جائیے۔“

”سفر تو بے شک لمبا ہے۔ بہت طویل۔ لیکن منزل کا نشان کسے ملتا

ہے۔ اگر ملے بھی تو بھی سراب ہے۔“ اس نے اپنی بے چین نگاہوں کو ڈبے

کی محدود چار دیواری میں گھمایا اور پھر کہنے لگی۔ ”ابھی آپ کہتے تھے کہ میں

مصور ہوں یا شاعر۔ کاش میں کچھ تو ہوتی۔ میری تو آرزو ہے کہ زندگی کا ایک

کھل شاہکار بناؤں۔۔۔۔۔جس کی لکیریں ٹوٹی ہوئی قسمت کی طرح ٹیڑھی ہوں،

جس کی سانس میں کائنات کی ازلی ہچکیاں ترپ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔اے کاش!“

اس نے ایک دلدوز آہ بھری۔ وہ درد کی کسی بے چین کک سے جھرجھریاں

لے رہی تھی۔ نہ جانے اس کے ہانپتے ہوئے سینے میں کن کن المناک جذبوں

کا جوار بھانا اٹھ رہا تھا۔

وہ کبھی ایک تھکے ہوئے خوابیدہ انداز سے بولتی تھی۔ کبھی اس کے

عنائی ہونٹوں پر خاموشی کا غبار سا چھا جاتا تھا۔ اس کا نام شکلیہ تھا۔ وہ ایک سیشن

جج کی بیوی تھی۔ اسے دنیا کی ساری نعمتیں میسر تھیں۔ وہ اُونچے گھر پیدا ہوئی۔

کشمیر کے شاداب خیابانوں میں پلی۔ ہریالی چٹانوں اور گانے والے جھرنوں کے

ساتھ کھیل کر جوان ہوئی۔ وہ جہاں کہیں بھی۔ کلب کی محفلیں اس کے دم

سے آباد ہو جاتی تھیں۔ رقص گاہوں کی فضا اس کے وجود سے منک اشعتی

تھی۔۔۔۔۔”لیکن معاف کیجئے۔“ وہ یکایک جھج گئی ”میں یونہی آپ کی صبح

خراشی کر رہی ہوں۔ معاف۔۔۔۔۔۔۔“

”ذرا دیکھئے تو“ میں نے التجا کی۔ ”آپ ساری رات کیسے گزاریں

گی؟“ ”گزر ہی جائیگی۔“ اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ ”یہ تو ایک رات ہے۔

سارا تنکے کا بھی ہو، تو زندگی بیت جاتی ہے۔“

”آپ تو مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔“ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر

اسے اٹھایا، اور برتھ پر بٹھا دیا۔

اس نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور پھر آنکھیں جھکالیں

میرے ہاتھوں میں ابھی تک بجلی کی لہری ترپ رہی تھی۔ لیکن اس کی سہمی

ہوئی نگاہیں دیکھ کر مجھے پشیمانی کا احساس ہونے لگا۔

”معاف کیجئے گا“ میں نے معذرت کی۔ ”آپ کو برا سو نہیں لگا؟“

”جی نہیں۔“ اس نے اپنی نازک ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کے کہا۔

”دنیا میں کمزور ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔“

میں شرمندہ ہو گیا، اور ٹرنک پر بیٹھ کے سگرٹ سلگانے لگا۔ وہ چھت پر

جگمگاتے ہوئے قمقمے سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی سرمیں آنکھوں

کے دامن میں پڑا سرا رچشے سے اہل رہے تھے۔ برتھ پر بیٹھی ہوئی وہ کسی

مصور کا رنگین شاہکار نظر آتی تھی۔ جو قوس قزح کی لڑیوں کو ملا کے بنایا گیا

ہو۔۔۔۔۔یا شاید وہ ککشاں کا ایک آوارہ کلڑا تھی۔۔۔۔۔۔۔میرا تخیل چوری

چوری شاعری کر رہا تھا!

”آپ کہاں تک جائیں گی؟“ میں نے وہ سکوت توڑنا چاہا جو میری

فجالت نے کمپارٹمنٹ پر طاری کر دیا تھا۔

”جی؟“ وہ جیسے کسی گہرے خواب سے چونک اُٹھی۔ ”کیا فرمایا آپ

نے؟“

”معاف کیجئے گا۔ میں یونہی آپ کے استغراق میں مغل ہوا۔“

”جی نہیں۔ آپ شوق سے فرمائیے۔ میں تو یونہی بیٹھے بیٹھے کھو جاتی

ہوں۔“

چوری جھانک رہا ہو۔ میں ٹرک پر بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے ایک گرم گرم، نازک نازک احتاس کے ساتھ بے پناہ رحم کا جذبہ سر اٹھانے لگا۔ نہ جانے اس کے سینے کے مدوجزر میں کیا کیا حسرتیں روندی پڑی تھیں۔ شاید وہ اپنے خوابوں کی بستی کو ہالیہ کے چشموں میں ڈبو بیٹھی تھی۔ شاید اس کی آرزوؤں کے موتی کسی بھڑکی رقص گاہ کے فرش پر بکھر کے پامال ہو گئے تھے۔ شاید وہ اپنے سشن جج خاوند سے محبت نہ کر سکتی تھی۔ شاید وہ سلمی نظام کا ایک اور زخم خوردہ شکار تھی۔ مجھے بے تحاشہ غصہ آنے لگا۔ فطرت کے وسیع مرغزاروں پر تہذیب کے جھگمگاتے ہوئے ایوانوں پر، اس کے سشن جج خاوند پر۔ جنہوں نے اس حسین فرشتے کو بے یار و مددگار زندگی کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ بے سارا، بے سامان۔ وہ کون ہے؟ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ کیا کرے گی؟۔۔۔۔۔۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر چلتی ہوئی گاڑی سے کود پڑوں۔ اور کائنات کی وسعتوں سے للکار للکار کر کہوں کہ وہ میری حفاظت میں ہے! میں اس کی زندگی کے سامنے ایک مضبوط چٹان کی طرح تن کر کھڑا ہو جاؤں۔ قسمت کے زہریلے تیر اڑتے ہوئے آئیں اور میرے سینے سے ککرا کر پھوڑ پھوڑ ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ خیالوں کی اس سنہری دنیا میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں قرون وسطیٰ کا ایک بہادر سپاہی ہوں، جو اپنی محبوبہ کو کندھے پر اٹھا کر ساری دنیا سے مقابلہ کرنے نکلا ہے۔۔۔۔۔۔ اسی بھول بھلیاں میں بیٹھے بیٹھے شاید ساری رات بیت گئی۔ آسمان پر صبح صادق کی ہلکی ہلکی سفیدی جھلکنے لگی۔ وہ ابھی نیند کی گود میں مدہوش پڑتی تھی۔ میں نے ہولے ہولے اپنا صندوق کھول کر ایک عمدہ سانیلا سوٹ نکالا۔ نئی ٹائی منتخب کی۔ اچھا سا بھیٹا بھیٹا عطر چٹا۔ اور حجامت کا سامان لیکر غسل خانے میں چلا گیا۔

میں نے خاص اہتمام سے رگڑ رگڑ کے حجامت بنائی۔ اور خوب صابن مل کر رات کے ٹھنڈے ہوئے پانی سے نہانا شروع کیا۔ تاکہ جب اس کی آنکھ

”جی نہیں۔“ میں نے اشتیاق سے التجا کی۔ ”یہ آپ کیا فرماتی ہیں؟ آپ کی زندگی میں ضرور کوئی غلطی ہے۔ آخر انسانی ہمدردی بھی کچھ چیز ہے۔ زندگی کا دکھ بھاتا نہیں، لیکن سنانے سے ہلکا تو ہو جاتا ہے۔“

وہ ایک تھکی ہوئی اگھڑائی لے کر برتھ پر نیم دراز ہو گئی۔۔۔۔۔۔ ”شکریہ۔“ اس نے ایک البیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اگر دنیا میں انسانی ہمدردی نہ ہوتی تو یہ زمین آگ کا انگارہ بن جاتی۔ لیکن ہر چیز کی ایک انتہا ہے۔ آپ میری آپ بیتی سننا چاہتے ہیں؟ آپ کی دلچسپی سر آنکھوں پر۔ لیکن سنتے سنتے جب آپ کا شوق مایوسی میں بدل جائے، تو خدا را مجھے بتا دیجئے گا۔ تاکہ میری زندگی میں لمحہ دو لمحہ کے لئے آپ کی ہمدردی کا جو ننھا سا چراغ روشن ہوا ہے، وہ بجھنے نہ پائے۔ میں ڈرتی ہوں کہ شاید صبح کی پو پھٹتے ہی آپ کے دل میں میرے لئے نفرت کا فوارہ پھوٹ بیسے گا۔ کون جانتا ہے کہ آپ کو مجھ پر غصہ بھی آئے۔ کیونکہ میں نے آپ کا برتھ ہی نہیں چھینا، بلکہ آپ کے دل سے ہمدردی کے آگینے بھی چرا لئے ہیں۔ شاید صبح ہوتے ان آگینوں کو ٹھیس لگ جائے۔۔۔۔۔۔ کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟۔۔۔۔۔۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔۔۔۔۔۔ اُف میرے خدا۔۔۔۔۔۔ آپ مجھے ضرور معاف کر دیں۔۔۔۔۔۔ ضرور معاف۔۔۔۔۔۔“ وہ اپنے تخیل کی رو میں بہتے بہتے خاموش ہو گئی۔ اس کی گھنی پلکیں تھکی ہوئی غنودگی کے ساتھ جھلکنے لگیں۔ اور تھوڑی دیر میں وہ غیند کی پُرسکون آغوش میں سو گئی میں نے آہستہ سے اپنا سرخ ریشم کا لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔

وہ سوئی ہوئی تھی۔ یا شاید وہ غیند کے پردے میں بھی زندگی کے کسی خوفناک تانے بانے میں الجھ رہی تھی، جو مکڑی کے جالے کی طرح اس کے دل اور دماغ پر چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی سانس کے دھیمے دھیمے آثار چڑھاؤ سے ریشمیں غلاف میں ننھی ننھی پھریریاں اٹھ رہی تھیں۔ سرخ لحاف کی سلوٹوں میں اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح تھا۔ جو شفق شام کی ادھ میں چوری

برتھ اور بستر دونوں چھین لئے۔۔۔۔! دسمبر کی ٹھنہری ہوئی صبح میں بھی مجھے پسینہ آگیا۔ اور میں نے پانی کا تل کھول کر اس کے نیچے سر رکھ دیا۔
 بہت دیر کے بعد جب میں غسل خانہ سے نکلا تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔
 امریکی کرنل صاحب اپنے بستر پر بیٹھے صبح کی چائے نوش کر رہے تھے۔ میری سیٹ پر دو چینی ہوا باز اور ایک خان صاحب قسم کے کپتان بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے ٹرنک پر ایک انگریز میجر رونق افروز تھے۔ میں نے اپنا بستر اٹھا کے تہہ کرنا شروع کیا۔ ٹکیوں میں سے ایک مشام نواز مہک نکل کر سارے کمرے میں بکھر گئی۔ اور ایک نازک سالباہاں کالے ریشم کے تار کی طرح اڑتا ہوا کپتان صاحب کے اخبار پر جا لگا۔ انہوں نے اسے والمانہ عقیدت کے ساتھ انگلی پر انگوٹھی کی طرح لپیٹ لیا۔ میری طرف کن آنکھوں سے دیکھ کر مسکائے۔ اور پھر جھوم کر ااپنے لگے۔۔۔۔۔

کئی ہے رات تو ہنگامہ گسٹری میں تری
 صحرا قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی!

کھلے، تو میں زندگی کی ایک نئی صبح کا خوش آئند پیام شانے کے لئے تیار ہو جاؤں۔۔۔۔ اتنے میں گاڑی رکی۔ غالباً ”گھیا“ کا سٹیشن تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد یکایک ہمارے ڈبے کا دروازہ کھلا۔ اور ایک پُر شوق آواز پکاری۔۔۔۔۔ ”ہلو ڈارلنگ تم یہاں ہو؟ میں تو سب ڈبوں میں کھوج آیا۔ میں نے کہا۔ میری شکل کہاں کھو گئی؟“

وہ شاید اس کا سشن جج خاوند تھا۔

”توبہ، میں تو یوں سو گئی کہ ہوش ہی نہ رہا۔“ ایک خوابیدہ آواز ترنم ریز ہوئی۔ پھر یکایک وہ آواز جھجکی، جھنجھلائی اور آہستہ سے بولی۔ ”آپ ذرا چلے جائیے، ڈارلنگ۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”لیکن سامان کہاں ہے، ڈارلنگ؟ چہر اسی ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”آیا کے پاس کسی ڈبے میں ہوگا۔۔۔۔۔ توبہ آپ چلے بھی جائیے، میں

ابھی آتی ہوں۔۔۔۔۔“

”ذرا ٹھہرو، شکل۔۔۔۔۔ یہ بستر تو بند حوالیں۔“

”ہائے میرے اللہ! بستر میرا نہیں ڈیر۔ آپ ذرا چلے جائیے نا۔۔۔۔۔“

”اوہو، ڈارلنگ، کیا بات ہے؟“ جج صاحب حیران ہو رہے تھے۔ ”میں نے کہا

پھر بتاؤں گی۔ توبہ آپ جاتے بھی تو نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

غالباً جج صاحب پلیٹ فارم پر ٹھٹھنے لگے۔ وہ دیر تک کپار ٹمنٹ کے

دروازے پر منڈلاتی رہی۔ میں نے غسل خانے کی دوسری کنڈی بھی اندر سے

چڑھا دی۔۔۔۔۔ جب گاڑی چلی، تو میں نے غسل خانے کی معمولی اٹھا کر باہر جھانکا

میرے رنگین سپنے صابن کے بلبلوں کی طرح ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے

پلیٹ فارم پر دو تین وردی پوش چہر اسی سامان اٹھوائے جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے

دونوں میاں بیوی ہاتھ میں ہاتھ دیئے خراماں خراماں چل رہے تھے وہ ہنستی

ہوئی مقلتی ہوئی جا رہی تھی۔ شاید وہ رات کے ڈرامہ کا ریہرسل بنا رہی تھی۔

جس میں ایک بے کس محبوبہ نے کسی جذباتی نوجوان کو خوب اُتو بتایا اور اس کا

سب کا مالک

سب کا مالک کون

اللہ!

سب کا مالک کون؟

اللہ!

سب کا مالک کون؟

جمعرات کے جمعرات مندی گرام کی بستی میں وہ پگلا سا فقیر آیا کرتا تھا لوگ اسے سائیں بابا کہتے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح اچھلتا پھلاتا دوڑتا چلتا اور پیپھڑوں کا پورا زور لگا کر سب کا مالک کون؟ اللہ----- کا ورد کیا کرتا تھا۔ بچے اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ مائیں اس پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔ گاؤں کے کھیا لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ ایک روز ننھی رضیہ ہاتھ میں سرسوں کے تیل کا کٹورہ اٹھائے جا رہی تھی، کہ اچانک ٹھوکر کھا کے گر گئی۔ تیل کا کٹورہ چھلک کر ٹالی میں جا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ اور دل میں خوف کے مرغولے لپکنے لگے۔ رضیہ کی ماں نے بڑی منت سماجت کے بعد رشی کیش بابو کی بیوی سے دو آنے ادھار لئے تھے۔ بجز لال بننے نے بڑی مشکل سے دوٹی کا چھٹانک بھرتیل دیا تھا۔ رضیہ کا باپ کئی روز کے بعد دریا سے مچھلی پکڑ کے لایا تھا۔ رضیہ کی ماں چٹو لھے پر ہنڈیا دھرے تیل کے انتظار

میں بیٹھی تھی۔ اب جو رضیہ نے دیکھا کہ آدھا تیل اس کے کپڑوں میں، اور آدھا زمین پر لٹھ گیا ہے، تو اس نے سارا زور لگا کر رونا شروع کر دیا۔ اتنے میں دور سے سائیں بابا کی آواز آئی۔ رضیہ نے دوڑ کر اس کی انگلی پکڑ لی۔ اور منت سے کہنے لگی۔ ”سائیں بابا، سائیں بابا۔ میرا تیل لٹھ گیا ہے۔ ماں مارے گی۔ سائیں بابا تم سب کے مالک ہو، مجھے ایک دوٹی دے دو۔“ یہ سن کر جیسے سائیں بابا کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ انہوں نے پھٹکار کر ہوا میں ایک طویل جست لگائی، اور رضیہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ”سب کا مالک کون؟ اللہ! سب کا مالک کون؟“ وہ چلا رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے رضیہ کے ہاتھ پر ایک دوٹی رکھ دی۔ جب رضیہ کے ماں باپ کو معلوم ہوا کہ وہ سائیں بابا سے دوٹی مانگ کر تیل لائی ہے، تو مچھلی کا گوشت کاٹا بن کر ان کے حلق میں پھنس گیا۔ اور انہوں نے غصے میں آکر رضیہ کے دونوں گال طمانچوں سے لال کر دیئے۔ شام کے وقت جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ مسجد میں قرآن مجید کا سبق لینے گئی، تو مولوی صاحب نے کہا۔ آج مالک آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں فرصت نہیں۔ جاؤ۔“

”کس کے مالک مولوی جی؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”ہم سب کے مالک بیٹی۔ چا۔ تو نہیں جانتی۔“

”ہاں ہاں جی۔ میں جانتی ہوں۔“ رضیہ کی آنکھوں میں غیر معمولی سی

چمک آگئی۔ ”سائیں بابا جو کہتے ہیں کہ ہم سب کے مالک اللہ میاں۔-----“

رضیہ کا فقرہ دانتوں کے درمیان کٹکٹا کے رہ گیا۔ مولوی صاحب نے

ایک زمانے کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور ڈپٹ کر بولے۔ ”کافر کی بیٹی! دو

سال سے پڑھ رہی ہے۔ ابھی اتنی تمیز نہیں آئی حرامزادی کو۔-----“

رات کو جب وہ تاروں کی چھاؤں میں پانگڑی بچھا کے لیٹی، تو دریا سے

آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کے تھمتائے ہوئے گالوں پر مرہم کا

پھاہا سا رکھ دیا۔ خیالوں کے عجیب عجیب تانے بانے اس کے دماغ میں الجھنے

لگے۔ اس کا چہرہ گویا فالٹو تھا کہ جو دیکھتا تھا اس پر بے تکلف چائے جمادیتا تھا۔ اسے اپنی بے پناہ مجبوری پر رونا آنے لگا۔ اور اس کے دل میں ایک زبردست خواہش ابھری کہ وہ اپنے روح کی ساری پنہائیوں کو اکٹھا کر کے آنکھیں میچ لے، اور دہلی زبان سے کہے کہ اے ہم سب کے مالک، تو جو کچھ بھی ہے، جہاں کہیں بھی ہے، میری ایک بات سن لے۔۔۔۔۔۔ نہ جانے اس کے دل میں کہا کیا شکوے تھے، کیا کیا فریادیں تھیں جن کو وہ اپنے خیالوں کی بھول بھلیاں سے کرید کرید کے نکالنا چاہتی تھی۔ لیکن مالک کے تصور نے اس کے تجسس کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دائیں گال پر سائیں بابا اور بائیں گال پر مولوی صاحب کی انگلیوں کے نشان تازہ ہو کے ابھر آئے۔ رات کے ستائے میں ایک بیٹھا بیٹھا سا ارتعاش اٹھ رہا تھا۔ دور حویلی سے جھم جھم جھم، چھما چھم جھم کی مدھم مدھم سی آواز آرہی تھی، جیسے بہت سی تیتریاں اپنے پروں میں گھنگھرو باندھ کر پھولوں پر ناچ رہی ہوں۔ رضیہ نے چوری چوری گردن اٹھا کر اپنے ماں باپ کو دیکھا جو آنگن میں تخت پوش پر لیٹے ہوئے خڑائے لے رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے دل کو دھوکا دینے کے لئے چادر کا گول مول اور لبوتر سا ڈھانچہ بنا کے چارپائی پر رکھ دیا اور دبے پاؤں باہر نکل آئی سونی اور تاریک گلی میں اسے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن مالک کو دیکھنے کا حق اس نے بڑی محنت سے خریدا تھا۔ پے درپے طمانچوں کی سرسراہٹ اس کے گالوں میں ابھی تک آگ سی جلا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں بابا کے نعروں کی گونج تھی۔ مولوی صاحب کے لمبے لمبے وعظ تھے۔ مندر کی گھنٹیاں۔ تلسی کے بوٹے۔ نماز۔ روزے۔ نیاز مالک کے لئے، مالک کے نام پر، مالک کی راہ میں۔۔۔۔۔۔ رضیہ کے دل میں مالک کا جو خلط ملط سا تصور تھا وہ اسے اندھیرے اور سنسان گلی میں بھی روشنی دکھاتا لئے جا رہا تھا۔ اس کے شوق اور تجسس میں قیصرانہ دارفتگی کا تناؤ آگیا تھا۔ اگر دنیا میں ایک اور موسیٰ کے لئے جگہ ہوتی تو لاریب مندی گرام کی وہ تاریک اور ویران گلی کوہ طور کی بلند چوٹیوں کے ہمدوش اٹھ جاتی۔۔۔۔۔۔

بڑی حویلی کے صدر دروازے پر اس نے رامانند چوکیدار کی منت کی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ رامانند ایک لمبے سے بچہ پر لیٹا ہوا اُونگھ رہا تھا۔ سارا سال وہ بڑی حویلی کے اندر رہتا تھا، لیکن سال میں اک بار جب مالک لگان کا حساب کرنے آتے، تو صدر دروازے میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ باغیچے میں پھولوں کی قطاروں کے درمیان مالک کا دربار لگا ہوا تھا۔ صدر میں مالک تھے۔ بائیں طرف مالک کے تحصیلدار، گماشتے، پیروی کار اور مصاحب تھے۔ دائیں جانب گاؤں کے کھیا لوگ تھے۔ ان میں مولوی صاحب تھے، پاٹھ شالہ کے پجاری، سکول کے ماسٹر، دونوں سیٹھ بھائی بالا بخش، بجرنگ لال اور ایسے ہی چند ایک اور جو دن بھر میں دو کی جگہ تین یا چار دفعہ پیٹ بھر سکتے تھے۔ درمیان میں ریتا بوس تھی۔۔۔۔۔۔ اس کے پاؤں میں جھم جھم جھم، چھما چھم جھم جھم بجنے والے گھنگھرو تھے۔ وہ ایک پتلی سی سرخ ساڑھی پہنے شعلے کی طرح ناچ رہی تھی۔ اس کے پیچھے سازندوں کی قطار تھی۔ چچی داڑھی والا چلی موٹا سا ہارمونیم ماسٹر، سوکھا ہوا زرد رُو سارنگی والا۔۔۔۔۔۔ ریتا اسی گاؤں کی چھوکری تھی، لیکن اب اس کا گھر کلکتے میں ہے۔ جب مالک آتے ہیں، تو گاؤں والے اسے تینیس روپے دن کے حساب سے چکلاتے ہیں۔ ریتا کی ماں مندی گرام میں کپڑے سیا کرتی تھی۔ جب اس کا چاندو باز خاوند اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تو سیٹھ بھائیوں بالا بخش، بجرنگ لال نے اپنے قرضے کا تقاضا شروع کیا۔ دو سو روپیہ اصل زر تو ہر قسم کی جنبش سے بے نیاز تھا۔ لیکن پانچ روپیہ ماہوار شرح سود کے عوض دونوں بھائیوں نے اسے ماما بنا کر گھر میں ڈال لیا۔ زندگی کے اس الٹ پھیر میں جب ریتا پیدا ہوئی تو سیٹھ بھائی بالا بخش، بجرنگ لال کے ساتھ سارے گاؤں نے یہ محسوس کیا کہ تلسی کے پودے میں ببول کا کانٹا آگ آیا ہے۔ انہوں نے بیک آواز اس کانٹے کو گاؤں سے نکال دیا۔ لیکن کلکتے میں جاکر یہی کانٹے گلاب بن جاتے ہیں۔ اب ریتا کا بھی چرچا ہے۔ اور جب سیٹھ بھائیوں بالا بخش، بجرنگ لال میں سے کوئی بیوپار کے سلسلے میں کلکتے جاتا ہے، تو

اس کے حساب میں عموماً چالیس روپے کی گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔

ریتا دادرے کی تال پر ناچ رہی تھی۔۔۔۔۔

مالک کے سامنے ارغوانی بوتلوں اور گلاسوں کی قطار تھی۔ ہر سڑیلے الپ پر وہ پورے کا پورا گلاس غٹ غٹ کر کے چڑھا جاتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک موٹے سے پلندے سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور انگلی پر رکھ کر ریتا کی طرف ہاتھ نہانے لگے۔ ریتا کبوتری کی طرح پھڑپھڑاتی لپکی۔ مالک نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور دونوں کے درمیان گویا آنکھ پھولی کا کھیل رہنے لگا، جس میں کبھی مالک کا ہاتھ ریتا کی سرخ ساڑھی کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا تھا کبھی ریتا کے گھنگریالے بال مالک کی بانہوں میں کھو جاتے تھے۔۔۔۔۔ اور جب وہ تھک گئی، تو اوئی کر کے اس نے اپنا سر مالک کے کندھے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے ان کی پھیلی ہوئی توند پھتہ پھانے لگی۔ مالک نے پانچ روپے کا نوٹ اس کے گلابی ہونٹوں کے درمیان لٹکا دیا۔ سازندوں نے زور سے اترے کی تان اڑائی۔ اور ریتا کو لھے مٹکا مٹکا کر، گردن گھسا گھسا کر ناچنے لگی۔۔۔۔۔ پھر ٹھمری شرع ہوئی۔ چچی داڑھی والے طیلی اور موٹے ہارمونیم ماسٹر نے ایک میلی سی چادر اٹھا کر محفل کی طرف تان دی۔ اور ریتا نے اس کی اوٹ میں کھڑے کھڑے اپنی لال ساڑھی اتار کر سبز انگرکھا پہن لیا۔ عین اس وقت مالک کو زور کی انگڑائی آئی، اور وہ کھڑے ہو کر ایڑیاں اٹھا اٹھا کے جمائی لینے لگے۔ یوں بھی ساری مجلس کی گردنوں میں بے نیکنے سے لوچ آ گئے۔ اور وہ اوپر اٹھنے لگیں۔ مولوی صاحب کن انکھیوں سے چادر میں کسی آوارہ چھید کو تلاش کرنے لگے۔ سیٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال نے ٹانگیں اٹھا کر زور سے ڈکاریں لیں۔ گماشتے اپنی مونچھوں کو بل دینے لگے۔ ریتا نے نیکی بانہیں سر پر رکھ کے ادھر ادھر دیکھا، اور آنکھیں مٹکا کر مسکرانے لگی۔۔۔۔۔

مالک کی بوتلیں خالی ہوتی گئیں۔ نوٹوں کا پلندا گھٹنا گیا۔ چادر جلد جلد تننے لگی ریتا نے رنگا رنگی ساڑھیوں کے پھول کھلائے۔ محفل پر ایک لطیف سا

سرور چھا گیا۔ رفتہ رفتہ مالک بھی ریتا کے گیتوں میں لقمہ دینے لگے۔ وہ گلا پھاڑ کر اس کی تان میں تان ملائے، اور کبھی گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر بدست بھینے کی طرح جھومنے لگتے۔ ریتا نے دیکر راگ گایا، پھر بایشری ہوئی۔ پھر وہ بھاگ کے سر پر ناچنے لگی۔ تین تال کی گت پر جھومتے ہوئے اس کی کمریوں لچکتی تھی جیسے گلاب کی ٹنٹی پر فاختہ بیٹھی ہوئی پھڑپھڑا رہی ہو۔ اس کے بال کالے ابر پاروں کی طرح پھیل گئے۔ اس کی بانہیں دالہانہ طور پر کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ مالک کے ہاتھ سے گلاس چھن سے گر گیا۔ ان کے ہونٹ تھر تھرائے۔ اور وہ ایک زبردست جنبش کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ کمر اور دوسرا سر پر رکھ کے مٹک مٹک کر ناچنا شروع کر دیا۔ سازندوں کے ساز بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرح تیز ہو گئے۔ ریتا کی بانہیں اور بھی سُرعت سے کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ اور پھر مالک نے جھپٹ کر اسے اپنی آغوش میں بھیج لیا۔۔۔۔۔

”سالا چور۔“ راماوند چوکیدار کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس نے ہاتھ سے ہاتھ جوڑ کے ایک زبردست جمائی لی، اور آنکھیں مل کر مالک کی طرف دیکھا جو ریتا کو گلے میں ڈالے دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ پھر اس کی نظر رضیہ پر پڑی جو دروازے کے ساتھ سائے کی طرح لگی بیٹھی تھی۔۔۔۔۔

”چل بھاگ، حرامزادی۔“ راماوند نے اس کے منہ پر تڑاخ سے تھپڑ مارا۔ ”شرم نہیں آتی، سُر کی بچی کو۔“

اس رات رضیہ کی نیند میں سونے اور چاندی کے گھنگھرو بجتے رہے۔ جب وہ جاگی تب بھی اس نے چاندی اور سونا ہی دیکھا۔ تخت پوش پر اس کا باپ رومال بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ماں اپنے میلے کپیلے زیور اکٹھے کر کے رومال میں ڈال رہی تھی۔ رضیہ کے ہاتھ میں بھی چاندی کے ہلکے ہلکے سے کنگن تھے۔ ماں نے چمکار کر اس سے کنگن مانگے۔ کیونکہ مالک کا لگان باقی اور آج ہی چکایا نہ گیا، تو شام تک ان کے گھر میں لال لال پگڑیوں والے گماشتوں کا

کے کپڑوں پر تیل چھڑک کے آگ لگا دی۔ اور پھر اپنے گلے میں رستی ڈال کر آم کے درخت سے لٹک گئی۔ ایک دن صبح سویرے لوگوں نے دیکھا کہ رضیہ کا باپ جھونپڑی کے باہر اوندھا پڑا ہے۔ اور ایک بھوکا پیاسا گیدڑ اس کی ایزبوں میں دانت گاڑے خرخر مٹہ چلا رہا ہے۔ رضیہ کے باپ میں ابھی ایک رمت جان باقی تھی۔ لیکن اس کے بدن میں اتنا سارا نہ تھا کہ وہ اس حریص درندے کے منہ سے اپنا پاؤں چھڑا لے۔ اس کے ہونٹ بھیج کر دانتوں کے درمیان کٹ گئے تھے۔ اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دو گدلے سے آنسو بھرے ہوئے تھے جیسے بلور کی گولیوں پر دھند کے بادل جم گئے ہوں۔-----

ایک روز بجرنگ لال کا بھائی بالا بخش ان کی جھونپڑی میں آیا۔۔۔ ایک موٹی سے بی الٹ پلٹ کے اس نے کوئی ساڑے پانچ من دھان کا حساب جوڑا۔ جو رضیہ کے باپ نے کسی وقت بیج کے لئے اُدھار لئے تھے۔ ”بھاؤ تمیں ہے۔“ بالا بخش پان چا کر بولا۔ ”لیکن میں بیس روپیہ من ہی لگاؤں گا۔ کل 110 روپے نقد ہوئے۔“

پھر اس نے نظریں گاڑ کر رضیہ کی ماں کو پرکھا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اور پان کی پیک کا ایک بڑا سا گھونٹ غٹ کر کے نگل لیا۔

”تو فکر نہ کر۔“ بالا بخش دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ ”رضیہ کی ماں تیری عمر ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ تو جب کہے گی بی میں رسید چڑھا دوں گا ہاں! لیکن بھٹا کو خبر نہ لگے!“ بالا بخش نے آنکھ میچ کے مستقبل کا ایک لذیذ سا چٹکارہ لیا۔

دوسرے روز بالا بخش کا بھائی بجرنگ لال آیا۔ اس نے بھی ایک موٹی سی بی میں ساڑے پانچ من دھان کا حساب کیا اور تمیں کی جگہ بیس روپیہ من کے دام سے 110 روپے نقد کی رقم جوڑی۔

”روپیہ سالا کیا ہے، رضیہ کی ماں“ بجرنگ لال نے سرگوشی کی۔ ”ساری بات تو دل کی ہے۔ تو چاہے تو سارا حساب کاٹ دوں۔ آپس کی بات ہے

جنگٹا لگ جائیگا۔ رضیہ نے بہتیرا کہا کہ مالک کے پاس تو نوٹوں کے بھاری بھاری پلندے ہیں۔ اس کو ان معمولی کنگنوں کی ضرورت کیا؟ وہ روئی تھی۔ ماں نے دم دلا سادے کر اس کے کنگن اتار ہی لئے۔

”آنسو نہ بہا بیٹی۔“ باپ نے اپنے آنسو روک کر کہا۔ ”میں اس مہینے بہت سادھان اکٹھا کر لوں گا۔ اور پھر تمہارے لئے سونے کے کنگن بنوا دوں گا۔“

مہینہ بھر رضیہ کے دماغ میں سونے اور چاندی کے کنگن خواب کی طرح آتے اور جاتے رہے۔ اس کے باپ نے دن دگنی اور رات چوگنی محنت کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آٹھ دس من دھان جمع کر لئے۔ چاول کا بھاؤ روز بروز چڑھتا جا رہا تھا۔ بالا بخش بجرنگ لال کے دلال اور آڑھتی دھڑا دھڑا اونے پونے چاول اور دھان خرید کر جمع کر رہے تھے۔ آٹھ روپیہ من سے دس، بیس، پچیس، تیس، پھر پینتیس روپیہ من کا بھاؤ ہو گیا۔ لیکن کسانوں کے ذخیروں کی کنجیاں سینٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال کے ہاتھ میں تھیں۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر بچائے ہوئے چاول اور سو پینہ ایک کر کے جمع کئے ہوئے دھان پانچ روپیہ من کے حساب سے اٹھتے گئے۔ کچھ اصل زر میں کٹ گیا، کچھ سود میں لگ گیا۔ باقی بھی کھاتوں کی اتھاہ گمراہیوں میں ڈوب گیا۔۔۔۔۔ اور جب گلی کوچوں میں نندی گرام کے ہتے کھیلے چہرے ہڈیوں کے ڈھانچے بن کر گرنے لگے، تو رضیہ کے کنگنوں کا خیال دو نوالے چاول بن کر اٹل گیا۔ بچوں کی پسلیاں چڑچڑ کر کے اندر کی طرف دھنس گئیں، اور پیٹ غبارے کی طرح پھول کر ابھر آئے۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ سوکھ کر ڈھلک گئیں۔ جیسے چیلوں کے پتے میں مردار گوشت کے لو تھڑے لٹک رہے ہوں۔۔۔۔۔ آدمیوں کا لو ٹھنڈی آہیں بن کر اڑ گیا۔ کشوری چرن سارا دن چوراہے میں گرا ہوا دم توڑتا رہا۔ لوگ ناک پر کپڑا رکھ کے گزر گئے، راستہ کترا کے نکل گئے۔ کسی سے یہ نہ ہوا کہ اس کے سوکھے ہوئے گلے میں پانی کا آخری گھونٹ نکا دے۔ ہم لتا کی ماں نے بیٹی

عورتیں بہت سے مرد۔۔۔۔۔ ان میں سائیں بابا بھی تھا۔ وہ ایک کونے میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹ کھلتے تھے اور وہ آہستہ سے کہتا تھا سب کا مالک کون؟ اللہ! سب کا مالک کون؟۔۔۔۔۔

جب رات ہوئی تو ریتا نے گلابی ساڑھی پہن کر سنگار کیا۔ اس نے اپنے ہتھکڑیا لے بالوں میں پھول لگائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بیٹھک میں چلی گئی۔ اس کے ہتھکڑی چم چم چم، چم چم چم، چم چم چم بننے لگے، اس کی کمر سانپ کی طرح بل کھانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کی ٹاؤ تیرنے لگی۔۔۔۔۔ زندگی کے اس دو دھارے میں ایک طرف سائیں بابا تھا۔ دوسری طرف ریتا بوس اور درمیان میں رضیہ تھی، جس کے ہاتھ میں ابھی تک مالک کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

ماما

دوسرے کمرے سے ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ ماما اپنی کوٹھڑی کے درپے میں بیٹھی ہوئی سوئی میں دھاگا ڈال رہی تھی۔ وہ جتنی بار سوئی کے ٹاکے پر ٹٹکی باندھنے کی کوشش کرتی، اس کی آنکھوں میں مکڑی کے جالے سے تن جاتے اور اس کو یوں نظر آنے لگتا جیسے ہوا میں رنگ برنگی پتلیاں سی گھوم رہی ہوں۔ صابن کے بلبلیوں کی طرح سرخ سرخ، نیلے نیلے، سبز بھنور اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتے۔۔۔۔۔ اور پھر یکایک ایک عمیق اندھیرا چھا جاتا۔۔۔۔۔ ماما کے ہاتھوں میں بھی اب ایک کنزور سی کچکپاہٹ رہا کرتی تھی، اور کبھی تو وہ بیٹھے ہی بیٹھے سینے میں شرابور ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔

اس نے سوئی اور دھاگے کو ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا، اور پھر اپنے کمرے کے دامن سے پینہ پونچھنے لگی۔ اس کے بال ادھ کچے ادھ کچے ہو گئے تھے اور اس کے منہ پر جھریوں کے ساتھ ساتھ ایک میلی کچیلی پیلاہٹ سی چھا گئی تھی۔ جب اسے پینہ آتا، تو اس کے چہرے کے موٹے موٹے مسام کھل کر ابھر آتے۔ اور پھریوں نظر آنے لگتا جیسے کسی پھٹی پرانی چھردانی کا ٹکڑا گدے سے پانی میں بھیگ گیا ہو۔۔۔۔۔

دوسرے کمرے میں ریڈیو کی آواز مدھم ہوئی، اور ایک مترنم آواز نے اس کو بلایا۔۔۔۔۔ ”ماما۔“

ماما تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے گھٹنوں میں ایک کنزور سی

صاحب کا کام بئرا کرے گا۔“

”جی اچھا بیگم۔“

”ایک ہی مہینہ کے لئے جاتا ہے۔“ بیگم نے لمبی آواز کر کے کہا۔
 ”زیادہ سامان لادنے پھانڈنے کی ضرورت نہیں۔ کپڑے چھانٹ کر چڑے کے
 سوٹ کیسوں میں ڈال دو۔ میں بھی ابھی آتی ہوں۔ تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی۔“
 ”آپ زحمت نہ اٹھائیں، بیگم میں سب سنبھال لوں گی۔“
 ”نہیں ماما۔“ بیگم نے نرمی سے کہا۔ ”تم سے اتنا کام ہوگا، بھلا؟ میں
 ابھی آتی ہوں، تم چلو۔“

ریڈیو میں کوئی دھیمے دھیمے سُر میں ستار بجا رہا تھا۔ بیگم نے تھکے ہوئے
 انداز سے مخملی پٹھر کا گالوں پر پھیرا، اور صوفے پر نیم دراز سی ہو گئی۔
 ماما کی آنکھوں کے سامنے مٹری کے جالوں کی بجائے اب رنگ برنگ
 کی ساڑھیاں، ریشمی دوپٹے، اور مخملی قمیضیں تھیں۔ جب اس کی انگلیاں
 کپڑوں کی نرم نرم، گداز گداز تھوں میں دھنس جاتیں، تو اسے ایک قسم کا
 سکون سا محسوس ہوتا۔ اور وہ سوچتی کہ بیگم کے چھریرے بدن پر جو گلاب کے
 پھول کی طرح ملائم اور مشکبار جلد ہے، اس کے لئے ایسے ہی نرم اور گداز
 کپڑوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اور پھر اس نے اپنے کھدر کے قمیص کے دامن
 سے چہرے کا پسینہ پونچھا، اور شلواریوں کی تہ لگا کر صندوق میں رکھنے
 لگی۔۔۔۔۔ بار بار انھنے بیٹھنے سے ماما کی ٹانگوں میں کپکپی ہونے لگتی، اور جب وہ
 کسی بھاری صندوق کو زور لگا کر کھینچتی تو اس کے منہ پر پسینے کا سیلاب سا آ جاتا،
 اور بدن کی ہڈیاں ٹوٹے ہوئے ستار کے تاروں کی طرح جھنجھنا
 اٹھتیں۔۔۔۔۔ لیکن پھر یکایک کسی ساڑھی یا شلوار کی تہ سے بیگم کے سینٹ کی
 بھینی بھینی لپٹیں نکل کر ماما کے دماغ پر نشے کی طرح چھا جاتیں۔۔۔۔۔

”اوہو، ماما۔“ بیگم ایک جوان مرغابی کی طرح تیرتی ہوئی کمرے میں
 آئی۔ ”تم نے تو بہت سا کام سمیٹ لیا۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ صاحب آگئے تھے۔“

ککٹاٹھ ہوئی۔ اور پھر اس کی پنڈلیوں میں گویا چیونٹیوں کی ایک لمبی سی قطار
 ریگننے لگی وہ لڑکھرائی، اور دروازے کا کواڑ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

”ماما۔“ اس مترنم آواز نے ذرا زور سے پکارا۔

”آتی ہوں بیگم۔“ ماما نے جواب دیا، اور پھر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر
 ڈرائنگ روم میں گئی۔

بیگم نے ذرا غصے سے کہا۔ ”اے ہے ماما یہ کیا بات ہے؟ برسوں سے
 پکار رہی ہوں تم کو۔“

بجلی کی تیز روشنی میں ماما کی آنکھوں کے جالے کچھ مدھم پڑ گئے، اور
 وہ بیگم کے گالوں پر گلابی ڈورے سے دیکھ کر ذرا ٹھٹک گئی۔ صاحب ہمیشہ کہا
 کرتے تھے، کہ غصے کے جوش میں بیگم کی دلکشی میں گلاب کھل جاتے ہیں!
 بیگم نے ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ذرا نرمی سے بولی
 ”دیکھو ماما صاحب نے دفتر سے فون کیا ہے، کہ اُن کو چھٹی مل گئی ہے۔ اب ہم
 کل پہلی گاڑی سے دارجلنگ روانہ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ اُف، یہ گرمی“ بیگم
 نے مخملی پٹھر کے سے پیشانی مل کر کہا۔

”اللہ جانے آج اتنا اس کیوں ہے؟“ بیگم کچھ مڑھال سی ہو گئی۔

”ذرا پنکھا تیز کر دوں، بیگم؟“ ماما نے دیوار پر لگے ہوئے سوچ کی
 طرف جاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں ماما“ بیگم شکستہ سی ہو کر بولی۔ ”یہاں ایک مصیبت کیا کم
 ہے پنکھا تیز ہو تو اس ریڈیو میں ہل چل مچ جاتی ہے۔۔۔۔۔ اللہ ماری گرمی کیا
 ہوئی مستقل دوزخ بن گئی۔“

”میں ابھی تازہ لیموں کا شربت لاتی ہوں بیگم۔ طبیعت سنبھل جائے
 گی۔“

”رہنے دو، ماما۔“ بیگم نے کہا۔ ”کوئی کہاں تک شربت پیتا جائے۔
 گاڑی مچ چھ بجے چھوٹی ہے۔ تم راتوں رات میرا سامان درست کر دو۔“

جال

اس کے قدم ڈمگائے، وہ لجائی، لیکن پھر اس نے قینچی اٹھا کر اپنے لائے لائے سیاہ بالوں کا ایک گھٹا سا گھٹا کاٹ ڈالا۔ اب جیسے نرملا کا دل ٹھنڈا سا ہو گیا۔ اور اس کی پہلی کپکپاہٹ اور جھجک دور ہونے لگی۔ وہ دیوار کا سہارا لیکر بیٹھ گئی، اور تھوڑی دیر میں اس کے سامنے اپنی لمبی لمبی گھنگھریالی زلفوں کا انبار لگ گیا۔۔۔۔۔ جیسے غصے میں پھرے ہوئے کالے کالے زہرناک سانپ الجھ پڑے ہوں۔ اس شام جب بوڑھا ماہی گیر گھر لوٹا، تو اس نے دیکھ کر اس کا ٹوٹا ہوا جال درست ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں خوشی کی ایک لہری اٹھی۔ لیکن جب وہ اپنے سکرے ہوئے خشک ہونٹوں سے مسکراتا ہوا نرملا کی طرف بڑھا، تو یکایک اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کا ہاتھ جو پیار کے جھٹکے سے نرملا کے سر کی طرف اٹھا تھا، ہوا میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ اسے یوں نظر آنے لگا جیسے اتار کے ٹمٹماتے ہوئے شگونے پت جھڑ میں گر گئے ہوں۔ نرملا نے اپنی ساڑھی کا آٹھل احتیاط سے سر پر اوڑھا ہوا تھا، لیکن کمر تک جھوننے والی ریشم ایسی زلفوں کی جگہ کون لیتا؟ ماہی گیر نے غیر ارادی طور پر اپنے جال کو اٹھایا۔ اور اس کے ہاتھ ان جگہوں کو ٹٹولنے لگے جہاں نرملا کے نرم نرم بالوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک جال کو ٹٹولتا رہا جیسے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ وہ کچھ نہ بولا۔ وہ بولتا بھی کیا؟ وہ بول ہی کیا سکتا تھا؟ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ جال کئی روز سے ٹوٹا پڑا تھا۔ وہ روز جلی کٹی سٹاتا اور کہا کرتا کہ آج دنیا کے

جھریاں موٹے موٹے مسام، ٹپ ٹپ کرتا ہوا پینہ۔۔۔۔۔ اب یوں نظر آتا تھا جیسے اس پھٹی ہوئی مچھردانی کا چھتہ کچھڑ میں لت پت ہو گیا ہو۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔
 "تی، تی، تی۔۔۔۔۔" اما کی صورت دیکھ کر بیگم کو ابکائیاں سی آنے لگیں، اس نے جلدی سے اپنا معطر پٹھر کا ناک پر رکھ لیا، اور دونوں آنکھیں زور سے بند کر کے بولی، "اے ہے، ماہ، تمہاری صورت کیا بن گئی ہے؟ ذرا جلدی سے جاؤ، میری سنگار میز پر پاؤڈر کا ڈبہ ہے، تھوڑا سا اپنے چہرے پر لگا لو۔"
 "پاؤڈر، بیگم؟" اما حیران ہو گئی۔

"ہاں ہاں، اما، بیگم نے بے صبری سے کہا۔ "ذرا جلدی کرو، نا۔ میں کب تک آنکھیں بند رکھوں گی؟"
 "او، زندگی! او، خدا!!
 اے موت!!!

اور جب اما واپس آئی، تو یوں نظر آتا تھا جیسے سوکھی ہوئی دلدل میں کچھ مرجھائی ہوئی کلیاں بھر گئی ہوں۔۔۔۔۔!
 بیگم نے ڈرتے ڈرتے، نیم باز آنکھوں سے اما کی طرف دیکھا، اور پھر ایک اطمینان کا سانس لیکر بولی۔۔۔۔۔ "ہاں تو، اما۔ ذرا جلدی جلدی کام کر لو، نا۔ صاحب کے کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔۔۔"
 اور پھر بیگم نے دیکھا کہ اس کی اونی شالیں تو ایک طرف بکھری پڑی ہیں! "اوہو، اما" اس نے تنک کر کہا۔ "تم بھی عجیب ہو۔ یہ اونی شالیں تو صندوق میں ڈالی ہی نہیں۔۔۔۔۔ ان کے بغیر دار جلنگ میں گزارہ ہو گا بھلا؟
 اُونہ، اما!"

پیٹ میں آگ سی جل رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ تھی۔ اس کا دل غم اور غصے کے جوار بھائے میں ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ زلطا دیر تک جھونپڑی کے دروازے سے لگی ہوئی اپنے بڑھے باپ کو دیکھتی رہی۔ جب وہ دریا کے کنارے پھیلے ہوئے ناریل کے درختوں میں او جھل ہو گیا تو زلطانے اپنی تھکی ہوئی آبدیدہ آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔۔ جیسے پھول کی پتی شبنم کے بوجھ سے جھک جائے۔ وہ دیر تک کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ شاید اس کے دماغ میں بھی سنہری مچھلیوں کے خوشگوار خواب تیر رہے تھے۔ شاید وہ بھی اپنے دل میں امید کے سوہوم چراغ جلا رہی تھی۔۔۔۔۔ یوں کھڑے کھڑے یکایک اس کو محسوس ہوا، جیسے کوئی سانپ اس کی ٹانگوں میں لپٹا جا رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، تو دیکھا کہ چارو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا اپنا سبزا گھوچھا اس کی ٹانگوں کے گرد باندھ رہا ہے! زلطا کے مرجھائے ہوئے ہونٹ مسکرائے، اور اسے بے اختیار ہنسی آنے لگی جیسے نسیم سحری کا ہلکا سا جھونکا افسردہ پھولوں میں جان سمو دے۔

”دہشت، چارو!“ زلطا اس کے کندھے پر ہاتھ مار کے بولی۔ ”تو نے تو مجھ کو ڈرا دیا۔“

چارو ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ مسکراتے وقت اس کے سفید سفید دانت تاروں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے، اور اس کی بڑی بڑی مستانہ آنکھیں لبریز پینانوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہ ہمیشہ سے اسی طرح مسکراتے آئے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا کیف سا ایک گہرا سرور سا ان کی زندگی پر چھایا جا رہا تھا۔

”میں تو سمجھی کوئی زہریلا سانپ میری ٹانگوں کو جکڑ رہا ہے!“ زلطانے ایک پڑا طمینان سانس لے کر کہا۔

چارو کھلکھلا کر ہنسا اور اس نے اپنا سیلا سا اٹھوچھا پیار سے زلطا کے گالوں پر مارا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بھولی لڑکی، تم کیا جانو محبت کی بیڑیاں کس کو

بڑے بڑے مایہ گیر اپنا تانا بانا بننے میں لگے ہوئے ہیں۔ اب اس کے جال کی مرمت کے لئے سوت کہاں سے آئے؟ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ زلطا اپنے آنسوئی بالوں کو اس گندے سے، حقیر سے جال کے ساتھ پیوند کر دے۔۔۔۔۔ سوت کے دام اُونچے سسی، اس کی بساط سے باہر سسی۔۔۔۔۔ لیکن زلطا کی لہرائی ہوئی متعجبدار زلفوں کی قدر کون پہچانے؟ مایہ گیر کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔۔۔۔۔ اور وہ لڑکھڑایا۔۔۔۔۔ لیکن پھر اس کے دماغ نے ایک کڑوٹ لی۔ اور اُسے وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں وہ سنا کرتا تھا کہ دنیا میں ایسی سوراخوڑی بھی گزری ہیں، جو ٹوٹی ہوئی کمانوں میں سر کے بال باندھ کر میدان جنگ میں جان کی بازی لگا دیا کرتی تھیں۔۔۔۔۔ مایہ گیر نے اپنی دھندلائی سی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا۔ اور اُسے اپنی زلطا ایک ویسی ہی شیردل، سوراخوڑی نظر آنے لگی، جو اپنے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کا جال بُن کر فاقہ مستیوں کو گرفتار کرنے نکلے ہو!

یہ کوئی پہلا روز نہ تھا کہ زلطا کے چٹولے میں آگ نہ سٹکی تھی۔ لیکن اب بڑھے مایہ گیر کو یقین سا ہونے لگا کہ کائنات بھر کی مچھلیاں اس کے جال میں آنے کے لئے بے تاب ہیں۔ وہ پل کی پل میں آس پاس کے شہروں میں مچھلیوں کے انبار لگا دیگا۔ پھر اس کے ٹھنڈے چٹولے میں بھی آگ جلے گی۔ اس کی دیران جھونپڑی میں پھر دھواں اُٹھے گا۔ اور زلطا کے سوکھے ہوئے کمزور ہونٹوں میں جان آ جائے گی۔۔۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے مایہ گیر نے زلطا کی طرف دیکھا تو اس کے خالی پیٹ میں ایک زبردست گھونسا لگا۔ زلطا جھکی ہوئی چٹولے کی راکھ نکال رہی تھی۔ اس کی ساڑھی کا پلو سر سے کھسک گیا تھا۔ بوڑھے مایہ گیر کی آنکھوں میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اس کی نظر گویا گرم گرم راکھ میں جھلس گئی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھا اور جال کندھے پر ڈال کر جھونپڑی سے نکل آیا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ بھوک کی تپش سے اس کے سمٹے ہوئے

چاڑو کا دبلا پتلا سڈول جسم تیز تیز چلنے میں یوں مل کھاتا تھا جیسے کسی گرتی ہوئی آبشار میں روہو مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ زمرلا جھونپڑی کی دیوار سے پیٹھ لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک موہوم سا ایک ناقابلِ فہم سا خطرہ لرز رہا تھا۔ وہ دم بھر کے لئے ساری کائنات کو بھول گئی۔۔۔۔ ماہی گیروں کی اس چھوٹی سی بستی میں مہینوں سے بھوک اور موت نے چھاؤنی ڈال رکھی تھی۔ پہلے چھوٹے چھوٹے فاقے آئے۔ پھر چٹوٹوں کی آگ سرد ہونے لگی۔ اور جب ہولے ہولے بوسیدہ جالوں کے تار بھی ٹوٹنے لگے، تو گویا بھوک سے تلملاتی ہوئی روحوں کے بندھن کھل گئے۔ اب کالی کالی گندی جھونپڑیوں کے دروازوں سے کراہتے ہوئے، بلباتے ہوئے، رینگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کی جگہ آزاد روہیں باہر نکلنے لگیں۔ جن کی پرواز کے سامنے زمین اور آسمان کی وسعتیں سٹ گئی ہوں۔ زمرلا جب گلی میں گرے ہوئے بچوں کو سانس توڑتے ہوئے دیکھتی، یا جب وہ جلتی ہوئی چٹاؤں میں سے چڑمڑ چڑمڑ کی بھیانک آواز سنتی، تو اُسے رہ رہ کر اپنے بڑھے باپو کا خیال آتا، جس کی

ہاتھ سے جال چھین کر تار تار کر ڈالے۔ اور اپنے بالوں کی رسیوں کو اس سبک خرام روہو کی کمر میں ایسے ڈال دے کہ وہ کبھی پھسل نہ سکے، کبھی منتشر نہ ہو۔۔۔۔۔۔

چاڑو تیز تیز جا رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک آنچ سی تھی۔ ایک بے کیف، بے شرار سی آگ جو بغیر ایندھن کے پٹوٹھے میں سلگ رہی ہو۔ لیکن جب اُسے نرملا کا خیال آتا تو وہ آگ گویا بجھ سی جاتی، اور اس کی زندگی پر ایک ہلکا سا سکھن چھا جاتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لہروں کا شباب زوروں پر تھا۔ پانی کے اُونچے اُونچے ریلے آتے اور ساحل کی دیواروں سے ٹکرا کر منتشر ہو جاتے۔ موجوں کے تھپیڑے چھلک چھلک کر اُٹھیلیوں کا ساز بجا رہے تھے، اور ماہی گیروں کی ہلکی پھلکی نوبیلی کشتیاں لہروں کے تلاطم میں یوں جا رہی تھیں، جیسے پانچویں رات کا چاند بھورے بھورے بادلوں کے درمیان بھاگا جا رہا ہو۔۔۔۔۔۔ لیکن چاڑو نے سوچا کہ یہ ٹیکھی ٹیکھی کشتیاں تو نرملا کی ہلکیوں کی طرح ہیں، جو پھلکتے آنسوؤں پر ڈمگ رہی ہوں! اس کا جی چاہا کہ وہ نرملا کے گالوں پر زور سے چٹکی بھرے اور اس کو ایک بار پھر ڈلا دے۔۔۔۔۔۔ سیلاب، کشتیاں، جال! وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ اور پھر ہاتھ اٹھا کر اس نے ہوا میں ایک طویل اور بلند بوسہ لے لیا!

آسمان پر ایک نیلا سا چاند ابھرا ہوا تھا۔ بڑھتی ہوئی شام کے شائے میں دریا کے تھپیڑے اور بھی بلند ہو رہے تھے۔ بڑھا ماہی گیر کنارے پر کھڑا ہوا جال کھینچ رہا تھا۔

”کو چاہا آج تو بورے بھر لئے تم نے؟“ چاڑو نے پاس آ کر پوچھا۔

بڑھے ماہی گیر کے دانت اس کی پسلیوں کی طرح کٹکٹائے۔ اور اس نے خالی جال اٹھا کر چاڑو کے سامنے پھینک دیا۔ نرملا کے بالوں کے پیوند اُلجھ اُلجھ کر کچھے سے بن گئے تھے، اور ان کی لپیٹ میں صرف دو ننھی ننھی مچھلیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

دھندلائی ہوئی آنکھیں روز روز اندر کو دھنستی جاتی تھیں۔ وہ کھانسی تو اس کی ابھری ہوئی پسلیاں غس غس بکتیں۔ اور جب وہ ہتھیل کے پتے نمک کے ساتھ کھا کر اوپر سے پانی کے دو چار گلاس پی جاتا تو اس کے سکرے ہوئے پیٹ کی لٹکی ہوئی جھریاں یوں بل کھانے لگتیں جیسے مرے ہوئے سانپ سورج کی گرمی سے تھوڑی دیر کے لئے ریگینے لگیں۔۔۔۔۔۔ باپو کھا کرتا تھا کہ بیٹی، بڑھاپا تو سوکھے ہوئے دریا کی مچھلی ہے، جو آج نہیں تو کل تڑپ جائے گی۔ لیکن نرملا کی کائنات میں باپو کے سوا اور کیا سہارا تھا؟ وہ سوچتی، اور سوچ کے رہ جاتی۔ رات کے وقت ڈراؤنے خواب اس کی نیند میں ہڈیوں کے ڈھانچے ہی ڈھانچے بکھیر دیتے۔ دن کے وقت اس کا بوڑھا باپ ٹوٹے ہوئے جال کو کندھے پر ڈال ایک زندہ لاش کی طرح گھومتا نظر آتا۔۔۔۔۔۔ اور اسی سوچ میں جب نرملا نے اپنی لہراتی ہوئی زلفوں کے تار کاٹ کر بڑھے ماہی گیر کا جال سنوار دیا، تو اس کے دل میں خوشی کی لہریں ناچنے لگیں، کہ اب اس کا باپو ریگیتی ہوئی، بلبلاتی ہوئی موت کے پھندے میں نہ آئے گا۔۔۔۔۔۔ لیکن!

لیکن اب نرملا کے دل میں ایک موہوم سا ایک ناقابلِ فہم سا خطرہ لرزنے لگا۔ وہ دم بھر کے لئے ساری کائنات کو بھول گئی۔ اپنے بڑھے باپ کو بھی، جس کی ٹیڑھی ٹیڑھی پسلیاں یوں کٹکٹاتی تھیں جیسے سوکھے ہوئے پیڑ کی شبنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ نرملا کے دل میں ایک گہرے قسم کا احتاس پشیمانی سر ابھارنے لگا۔ وہ اپنے وحشی اندیشوں کے گرداب میں پھنس کر کانپنے لگی۔ چاڑو کا ہلکا پھلکا سڈول جسم روہو مچھلی کی طرح بل کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ نرملا کے دل میں ایک پشیمان سی آواز کہہ رہی تھی، کہ یہ قوف لڑکی! تو نے اپنے ہاتھوں اپنا سنہری جال کاٹ ڈالا۔ اب وہ نکل جائے گا جیسے دریا کی مچھلی ٹوٹے ہوئے جال کے شکاف سے پھسل جاتی ہے۔ اور پھر وہ زندگی کے اتھاہ سمندر میں ایسا کھو جائے گا، ایسا کھو جائیگا۔۔۔۔۔۔ نرملا کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکلنے لگیں۔ اسے اپنے بڑھے باپ پر غصہ آنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ باپو کے

مسٹر رام لال کی آیا، آیا تھی تو کیا ہوا؟ عورت تو تھی۔ جوان تو تھی۔ خوبصورت تو تھی یوں کہنے کو عورت تو رام لال کی بیوی بھی تھی۔ جوان تو خان بہادر کی لڑکی بھی تھی۔ خوبصورت تو چیئر جی کی بیوہ ہو بھی تھی، لیکن خالی عورت ہونے اور جوان ہونے اور حسین ہونے سے تو کائنات کی کتنی ہاتھ میں نہیں آجاتی!

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

مزا تو جب ہے کہ مروتوں کو تھام لے ساقی

یہ ایک تھام لینے کا گر تھا جو آیا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پگھلے ہوئے جذبات کی بدرو میں بہتے ہوئے پانی کی طرح بہہ جانے نہ دیتی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ تھی۔ فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے عکس کو زندگی سے بھی خوشنما اور رنگین بنا کے دکھائے۔ آیا کا کمال یہ تھا کہ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی عورت سے زیادہ پُرکشش تھی، خانسماؤں، بیروں، مہتروں کی بات دوسری تھی۔ وہ اپنی چڑچڑی، تھکن آلود، زرد رو بیویوں سے اکتا کر ایک ایسی دنیا میں پناہ لیتے تھے جہاں تصور ہی تصور میں وہ بنگوں میں بسنے والی دودھ کی طرح گوری، بالائی کی طرح نرم اور ریشم کی طرح نازک عورتوں کو اپنی بانہوں کے درمیان جھنجھوڑ دیتے تھے۔ مسٹر چیئر جی کا خانساں رمضان دل ہی دل میں اپنے مالک کی بیوی سے عشق لڑاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ مسٹر چیئر جی کے چمچوں، پیالوں اور گلاسوں کو اپنی زبان سے چاٹ کر تر کر دیتا تھا۔ جب مسٹر چیئر جی اپنے چمچوں سے پڈنگ کھاتی تھی، یا پیالوں سے چائے پیتی تھی، یا بلور کے رنگین گلاس سے شیری کا پیگ نوش کرتی تھی، تو رمضان خانساں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسٹر چیئر جی کے عنابی ہونٹوں کو چٹا چٹا چوم رہا ہے!

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا! رام پر تاب مہتر نے ایک دوسری طرح اپنی تنگی دماغ کا علاج تلاش کر لیا تھا۔ وہ خان بہادر یوسف کے گھر کا بھنگی تھا۔ سولہ روپے ماہوار میں اسے تین غسل خانوں کا کام سمیٹنا پڑتا

۴ نمبر کی کوٹھی میں مسٹر رام لال رہتے تھے۔ ۸ نمبر میں مسٹر رام ہاتھ ۱۲ میں خان بہادر یوسف ۱۴ میں مسٹر چیئر جی ۱۸ میں مسٹر نواب۔ باقی کوٹھیوں میں بھی انسان ہی آباد تھے۔ لیکن ان کی بیویاں بد صورت تھیں یا پردے میں۔ ان کی بیٹیاں شاید ابھی جوان نہ ہوئی تھیں۔ ان کے خاندان روزے رکھتے تھے یا مندر جاتے تھے۔ ان کے مرد شراب پینے سے بچکھاتے تھے۔ ان کی عورتیں غیر مرد کے سائے سے بھی ڈرتی تھیں۔ سول لائن میں انکا وجود یوں تھا جیسے زعفران کے کھیت میں سرسوں یا شراب کے پیالے میں جوشاندہ، یا سیخ کے خستہ کبابوں میں ہڈی کے ٹکڑے! یہ کوٹھیاں سول لائن میں گم گشتہ مزاروں کی طرح آباد تھیں۔ جن پر نہ کوئی پھول چڑھاتا ہے نہ چراغ جلاتا ہے۔ نہ دل تھام کے دو کلمے دعا ہی کے ادا کرتا ہے۔ ان کوٹھیوں میں خانسماؤں کو باورچی کہتے ہیں۔ بیروں کو خدمت گار اور بیویوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج تھا۔ رات کے وقت یہاں بھی رومان کے فرشتے اترتے تھے لیکن ان کے نعروں کی صدائے بازگشت عموماً ایک نئے ننھے کی ریں ریں روں روں میں منتقل ہو جاتی تھی! ان خاندانوں میں خدا کی ذات پر ایک معصوم سا ایمان تھا۔ کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی بھی ساتھ لاتا ہے۔ لیکن وہ یہ فراموش کر دیتے تھے کہ خدا کی سلطنت میں بھی ڈاکو آباد ہیں۔ جو رنگ بھی چراتے ہیں، بھنگ بھی چراتے ہیں اور گندم کی سنہری خوشے بھی! جس کی لاشی اسکی بھینس۔ فرق تو سفید اور کالے تلوں کی قیمت میں بھی ہے پر انسان کی رنگت میں امتیاز کیوں نہ ہو۔ کوٹھور کی دلالی میں مٹہ کالا۔ جس کی رنگت سفید ہو وہ کوٹھے کی کان میں جسنے ہی کیوں؟ درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جانا! کوٹھے جب حد سے کالا ہوتا ہے، تو ہیرا بن جاتا ہے۔ کشش تو ہیرے کی ہے، کوٹھے کی نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوٹھے کی کانوں میں زہریلی گیسیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں حادثے بھی ہوتے ہیں۔ وہ پھٹ بھی جاتی ہیں اور جب وہ پھٹتی ہیں تو زمین کی تہ میں سوئے ہوئے مردہ کپڑے بھی ایک بار کھٹ لیتے ہیں!

مضبوط بازو سے ہوئے حسن کا سہارا بن جاتے تھے! عورتوں کے جسم پر بھی روز محمد ایک ہوشیار ڈرائیور کی طرح چچی تلی نظر ڈالتا تھا۔ چنانچہ اس نے دیکھی سنی، جان پہچان کی عورتوں کے نام بھی کاروں کے موڈل اور ان کی ساخت پر موزوں کئے ہوئے تھے۔ بیگم یوسف فورڈ ۱۹۳۸ تھی۔ مسز رام لال ماسٹر بیوک۔ مسٹر چیپریٹی کی بیوہ ہو سیکنڈ ہینڈ ٹورو۔ رائے صاحب کی کیم و سٹیم بیوی ہمبر کا کشادہ سیلون۔ کسی کو وہ ٹو میٹر کہتا تھا۔ کسی کو ریس کار۔ کسی کو بے بی آسن۔ اور آیا کا نام اس نے ٹیکسی رکھا ہوا تھا۔ سیٹی بجائی اور حاضر۔ میٹر کے حساب سے آٹھ آنہ فی میل کرایہ ہالٹ کا سوا روپیہ گھنٹہ۔ کبھی کبھار روپیہ آٹھ آنہ کی بخشش۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جن کے پاس بیش قیمت گراں بہا کاریں ہیں۔ لیکن وقت بے وقت ان کو بھی ٹیکسی پر چڑھنا ہی پڑتا ہے۔ خیر۔ روز محمد کا فلسفہ تھا کہ دنیا میں صرف موٹر ہی نہیں چلائی جاتی، عورت بھی چلائی جاتی ہے۔ فقط چلانے کا سلیقہ چاہیے اور چلنے کا بھی!

رات کے گیارہ بارہ بجے جب سول لائن کی دنیا پر گناہ و ثواب کے چکبرے سائے چھا جاتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے دو جلے بلائند منعقد ہوتے تھے۔ مردوں کی مجلس روز محمد کی کوٹھڑی میں ہمتی تھی! اس میں خانساواؤں اور بیروں، مسالچیوں، مہتروں اور ڈرائیوروں کی برادری کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ وہ خیال کی آنکھوں دیکھی اور دل کے کانوں سنی کہانیاں بیان کر کے روز محمد کی کوٹھڑی میں رومان کا ماحول کھڑا کر دیتے تھے۔ ایک خانساواں سناتا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے شامی لبابوں پر عنابی ہونٹوں کا ایک جوڑا بے طرح جھپٹا۔ ایک بیڑا کہتا تھا۔ کہ کاک ٹیل کا جام بڑھاتے بڑھاتے اس کے ہاتھوں نے کسی کی مخروطی انگلیوں کو چوم کر رکھ دیا ایک مسالچی کہتا تھا۔ کہ مصالحہ پیٹے ہوئے اس نے پانی کی بجائے اپنی دہن کا لعاب ملا دیا۔ دزویدہ محبت اور رومان کے یہ قہقہے روز محمد کے کمرے کی فضا کو معطر کر دیتے تھے لیکن پھر رام پر تاب مہتر اس رنگین ماحول میں گندے انڈے کی طرح

تھا۔ خان بہادر اور بیگم کے غسل خانوں میں جاتے ہوئے اُسے گھن آتی تھی۔ پیر اور دسکی کے پس خوردہ بکارات، ذیابیطس کے انٹیوین کی بدبو۔ کرچن سالٹ کے فیض کا رد عمل۔۔۔۔۔ وہ اس غیر طبعی ماحول کی غنوت سے گھبرا اٹھتا تھا۔ لیکن نعمت آراء کے غسل خانے میں جاتے ہی اس کے دل کی دنیا منک اٹھتی تھی۔ نعمت آراء خان بہادر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پتلے ہوئے آڑو کی طرح جوان۔ رام پر تاب کو نعمت آراء کے غسل خانے کی فضا میں گلاب اور چہچہا اور موچے کی سوندھی سوندھی خوشبو کا لطف آتا تھا۔ وہ بار بار ڈر کر صابن کی گیلی نکلیا کو چھوتا تھا اور شرماتا تھا کیونکہ کہ وہ نعمت آراء کے منکبوتن بدن کی آشنائے راز تھی۔ تولیے کی نرم نرم، تازہ تازہ نم آلودگی، اتارے ہوئے کپڑوں میں سلگتی سی آنچ کا احساس، نہانے کے ٹب میں پانی کے بلبلوں کی آنکھ میں سرور رفتہ کا غماز۔ رام پر تاب مہتر غسل خانے کی چٹنیاں اندر سے بند کر کے نعمت آراء کے ٹب میں بیٹھ جاتا تھا۔ نعمت آراء کا گیلیا صابن اس کی کالی کالی کھردری جلد کو اپنی ریشمیں اور مشکبار جھاگ کے غبار میں چھپا لیتا تھا اور جس طرح مقناطیس کی رگڑ لوہے کے ٹکڑے میں بھی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح نعمت آراء کے تولیے کی رگڑ بھی رام پر تاب کے نحیف اور خمیدہ بدن میں پتلے ہوئے آڑو کا رس بھر دیتی تھی۔ غسل خانے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ تصور ہی تصور میں اپنے روئیں روئیں کو نعمت آراء کے مرمر وجود سے آباد کر لیتا تھا۔ ایسے وقت اس میں اتنی ہمت بھی ہوتی تھی کہ وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر روز محمد ڈرائیور کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے اور اپنی چھاتی کی ایک ٹکڑے سے اسے پچھاڑ کے رکھ دے!

روز محمد بڑا چابک دست ڈرائیور تھا۔ وہ بہت سی نازک اندام حسناؤں کو پہلو میں بٹھا کر موٹر چلاتا سکھا چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اچھی سے اچھی کار کے کل پرزے بھی جھنجھٹا اٹھتے تھے۔ انجن کی رفتار خوفناک طور پر تیز ہو جاتی تھی اور خوف و ہراس، بیم ورجا اور بے بسی کے اس عالم میں روز محمد کے

نہا رہی ہے۔ مجھے بتا تو سہی کیا ارادہ ہے تیرا؟“
 ”چل، روجم“ آیا روز محمد کو روجم کہا کرتی تھی۔ ”تو نے تو مذاق بنا رکھا
 ہے مجھے تو کسی فیشن کی لت نہیں اپنی ضرورت سے سردھوتی ہوں۔ تم کیا
 جانو۔“

روز محمد نے ایک مشاق نظر آیا کے تن بدن پر دوڑائی۔ جیسے وہ موٹر
 کار کا ٹائر جانچ رہا ہو کہ ہوا پوری ہے یا کم۔ آیا نے شرما کر دھوتی کا پلو کمر پر
 اچھی طرح لپیٹ لیا۔ روز محمد آنکھوں کے گوشے سمیٹ کر مسکرایا۔
 ”آخر آگئی نارپوڑی کے پھیر میں! کتنی بار کہا تھا کہ سنہل کے چل۔
 لیکن تجھ پر تو جوانی کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ اب بول کس سالے کو باپ بتائے
 گی؟“

”باپ بتائے گی میری جوتی“ آیا نے تک کر کہا۔ ”میں تو اس کی ماں
 ہوں گی اسے باپ کی کیا پروا؟“

اری چپ رہ۔ تو نہیں جانتی سالے کو ٹھیوں والوں کو تجھے کان سے پکڑ
 کے نکال دیں گے۔ سور کے جنے گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز۔ چل تجھے
 لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ جو سو پچاس خرچ آئیں گے میں دوں گا۔
 تیری نوکری تو رہیگی میری لاڈ۔“ روز محمد بھی یاروں کا یار تھا۔ ڈرا یوروں کی
 منڈی میں اسے نئی لٹیرا کہا کرتے تھے۔

دم بھر میں آیا نے ساری کائنات کا جائزہ لے لیا اس نے اپنی زندگی
 کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ اپنی نوکری کا آگیا چھپا سوچا اور دنیا بھر کے بچے
 پالنے والی ماں کو خود اپنے بچے سے فرار کی کوئی دوسری راہ نظر نہ آئی۔ اگلی صبح
 جب روز محمد کار دھونے کے لئے گیا تو تالاب میں آیا کی لاش تیر رہی
 تھی۔۔۔۔۔ اب اسے ڈھونڈ چرائیخ زیبالے کر۔

آٹپکتا تھا، عنابی ہونٹوں، مخروطی انگلیوں اور لذیذ گالوں کے ذکر میں وہ نعمت آرا
 کے کموڈ کا قہقہہ لے بیٹھتا تھا۔ لیکن اس قہقہے میں بھی رس ہوتا تھا اور
 خانساؤں بیروں، مہتروں، مسالچیوں کی یہ برادری باورچی خانوں سے لے کر
 پائٹھانوں تک کی چار دیواری میں اپنی جنتِ گمشدہ کا سراغ پالیتی تھی۔

آیاؤں کی محفل میں رومانی قہقہے چلتے تھے وہ سر سے سر جوڑ کر رموز
 خودی اور اسرار بے خودی کی تفسیر گردانتی تھیں۔ وہ تو اپنی کوٹھیوں کے خلوت
 اور جلوت خانوں کی آشنائے راز تھیں۔ پرورش انسانی میں ان کا درجہ گویا ماں
 کا درجہ تھا۔ ان کے پاس جسم اور روح کی بالیدگی کے انوکھے گڑ تھے۔ سنسار
 مالا کی طرح ان کی آغوش سب کے لئے داغ تھی۔ بچے تو سکون پا کر ان کی چھاتی
 پر سو جاتے تھے۔ لیکن جوان اور بوڑھے اپنی ماؤں کو پہچاننے سے قاصر تھے۔
 آیائیں مسکراتی تھیں کہ چلو بیٹے خوش تو ہیں! جنیں ہوا تو کیا، چناں ہوا تو کیا!
 یوں بھی زندگی عزیز کی خاطر انہیں سو طرح کے ڈھنگ رچانے پڑتے تھے۔
 زبان کے چٹارے کے لئے خانساؤں کی خوشامد نئے کپڑوں کے لئے دھوبیوں کی
 منت۔ نئے دو نئے کی ضرورت کے لئے مہتروں، مسالچیوں اور بیروں کی
 سمجست، نوکروں کے لئے تو خیر ان کا وجود من و سلوئی سے کم نہ تھا۔ لیکن اپنے
 مالکوں کے لئے بھی وہ نعمت خانے کا ضروری جزو تھیں جنہیں وہ وقت بے
 وقت ذائقہ بدلنے کے لئے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس پر بھی شکوہ یہ تھا کہ
 آیائیں آوارہ ہیں! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

ایک دن روز محمد کار دھونے تالاب پر گیا تو اس کی نظر آیا پر پڑی۔ وہ
 نیلے کنارے والی سفید دھوتی بے پردائی سے بدن پر لپیٹے بیٹھی بال سکھا رہی
 تھی۔ آیا کو دیکھ کر روز محمد ہارن بجا بجا کر ساون کے نظارے ہیں، گانے لگا آیا
 نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھیج کر اسے غصہ سے گھورا۔

روز محمد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ”ہائے میری لاڈ۔ تیرے فیشن پر
 اللہ کی مار۔ میں کہتا ہوں گوری، نمونیہ سے مر جائے گی تو جب دیکھو تالاب پر

اس کے قریب آتا جائے گا، چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دور ہوتے جائیں گے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ میں نے کہا۔ ”گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو۔“ گوراں نے کہا۔ ”آ جاؤ! میں بھی اپنی منزل کے لئے بھٹک رہی ہوں۔“ جوں جوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا۔ میری منزل مجھ سے دور ہوتی گئی جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے، بھاگتا جائے اور انجام کار پانی کی ٹھنڈی لہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جائے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، اور جب میں نے گوراں کو قریب قریب پالیا تو وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت۔ مرمیس۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا۔ جھنجھٹا ہوا جسم عورت کی کائنات اس کا جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمیس بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احتاس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوبصورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے۔۔۔۔

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے۔ وہ میرا پڑانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی ستم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ میں ساڑھے بارہ سو پاتا ہوں۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چائنا مار کے گرجنے لگتا ہے ”اے او صاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاش۔ فرار۔ فلسفہ۔۔۔۔ میں کہتا ہوں سب بکو اس ہے۔ تم کیا جانو عورت کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھو۔ جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں، تو میں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں۔ آدھ سیر پالک لیتا ہوں، ڈیڑھ پاؤ، آلو، دو پیسے کے نمائز۔۔۔۔ اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کوئی حرامزادہ ضرورت سے زیادہ مٹی گرم کر دے، اور

تلاش

مابوس، غمدیدہ، بیزار۔۔۔۔ گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے جانے دو۔ اس کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ میرا اپنا کوٹ ہے میں اس کوٹ کو سنبھال کر رکھوں یا پھاڑ ڈالوں۔ خود پہنوں یا بیچ دوں، یا کسی راغبگیر کی بھولی میں ڈال دوں۔۔۔۔ مجھے کون روک سکتا ہے؟ میں اپنے کوٹ کا مالک ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گذرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خریدنے دو۔ مجھے پشیمانی کا احتاس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اور جس قیمت پر چاہے اسے بیچ دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز پر سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑائے خواہ مخواہ۔

سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھمبوں کے درمیان سنان اندھیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور اُجلے سائے ہیں۔ وہ سڑک کے کالے اور سفید دھبوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں۔ زندگی کے سائے چلتے پھرتے نشان ہیں۔ تھمتاتے ہوئے سورج کے سائے آورہ بدلیاں آجائیں تو زمین پر ایک محدود ساسیہ چھا جاتا ہے۔ تھکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ یوقوف آدمی! جوں جوں وہ ساسیہ

بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے دو بے لوث لمحے، اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے!۔۔۔۔۔ میں نے کہا، گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی، تو میں ارض و سما کی دستیں پھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا! اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے ٹوٹ کر مر جھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ بلکہ سڑک کی طرح، جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا سٹیم رولر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر رملتا جائے۔۔۔۔۔ پیدل چلنے والے جوتیاں چٹکتے گزرتے جائیں۔ ٹم ٹم اور ٹنگے چچ چچ کرتے نکلتے جائیں۔ موٹریں گرد اڑاتی بھاتی جائیں۔۔۔۔۔ سڑک بھستتی جائے۔ پتھر ٹوٹتے جائیں لیکن گزرنے والے گزرتے رہیں۔ چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونسپلٹی کا سٹیم رولر بھک بھک کرتا ہوا آئے۔۔۔۔۔ گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونسپل کمیٹی کی ہتھ سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کی طرح جھکے ہوئے ٹرک، موٹر کی طرح سبک رفتار چھو کرے، سٹیم رولر کی طرح ہمکتے ہوئے موٹے موٹے سینے۔۔۔۔۔ یہ آئے، وہ گئے! یہ کرے وہ پھسلے! یہ بیٹھے، وہ بھاگے!۔۔۔۔۔ اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی! گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوار تھیں حائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ننھی سی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے بہار نہیں مانگتی تھی۔ وہ زندگی کے ہم پر دو بے لوث لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کمرڈ کمرڈ چلتی ہوئی پن پتلی کو جاوہانی سکون دے سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

ظہیر کہتا ہے۔ ”عورت شہد کی قمی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چمچے میں رس پکاتی ہے۔“ ظہیر کہتا ہے۔ وہ رتنا بلی کے ہونٹوں کی لمٹاس پر اپنا قلعہ جماتا ہے۔ صلوقہ کی موسیقار آنکھوں سے اپنے مقولے چراتا ہے شور کہیں کا۔ ان دو سوتلی بہنوں کے سستے ایمار نے اس کو امداد کر دیا ہے اور

روپے۔۔۔۔۔ گزار بیگم، پانچ روپے۔ رتنا بلی، دس روپے، کیونکہ اس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا جڑ ہے اور اس کے عثمانی ہونٹوں میں پکے ہوئے انگوروں کا رس چھلکتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی۔ اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیئے۔

گوراں نے کہا۔ ”آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے۔“

ظہیر نے سوچا، وہ بن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بونہ نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا۔ ”مانگو کیا مانگتی ہو جانِ تمنا آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔“

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ ”ظہیر صاحب، میں روز روپیہ کماتی ہوں۔ آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ لے لئے آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں۔ ایک عورت سمجھیں۔۔۔۔۔ ایک لمحہ کیلئے آپ گاہک نہ بنیں، ایک مرد بن جائیں۔ بس یہ دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔“

ظہیر ہنسنے لگا۔ وہ اُلو کا چٹھا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا تھا۔ اُس نے زبردستی اسے بیس روپے دیدیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لئے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم ملے تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلاء مٹھ پھاڑے کھڑا تھا۔ وہ اپنے جھیسویں سالہ میں ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں تل تل کر بکتی رہی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان اپنی ہشتاپشت کی کچڑ اس پر اچھال چکے ہیں۔ بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیاہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چٹک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملائم اور مشکبار جلد کے نیچے بڑے

ایک وہ میری مقدس امانت ہے ”مقدس؟ ارے توبہ توبہ!“ ظمیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔۔۔۔۔ ”تم نہیں جانتے گوراں کو۔ اس کے جسم میں اتنے اتنے لمبے جراثیم ہیں۔ گلے ہوئے، زہریلے، مملک کیڑے۔۔۔۔۔ تم مقدس کہتے ہو، اس سڑتی ہوئی لاش کو؟“

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظمیر کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس کے نچلے جڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جاگرا۔ ظمیر نے گرم گرم، سرخ سرخ خون کی ایک کلی غٹ سے نکل لی۔۔۔۔۔ اور اگلے روز وہ گوراں کو لے آیا۔ وہ آئی۔ جھکتی ہوئی ہچکچاتی ہوئی۔ لجائی لجائی سی۔ جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دور افقی لکیر پر ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو!

ایک دن میں نے کہا ”گوراں، تمہارا چوبارہ تمہیں زیب نہیں دیتا تم اپنے بالاخانے کے پٹ مقفل کر کے رکھ دو۔“

گوراں حیراں سی ہو گئی۔ اس کے خوشنما ہونٹ تعجب سے کھل گئے۔

”کیوں؟“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”گوراں، تمہارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالاخانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کسی کے خوابوں میں بسنے والی عروسانہ تکمیل ہو اگلے مہینے ہم دونوں نیلکری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ ثور کے سینے ٹوریم میں داخل کرادوں گا۔ سینوریم کا بڑھا سپرنٹنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمہاری نس نس میں جو دہکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے، وہ مٹ جائے گا۔۔۔۔۔“

”تم سچ کہتے ہو۔“ گوراں نے کہا۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا

سکتی۔ میرے بالاخانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انہیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟“

وہ ایسی کھبوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی نہیں، رس لیتی ہیں۔ رس چوستی ہیں۔ رس چراتی ہیں۔۔۔۔۔ نیلم ستار کی طرح، جو بھری محفل میں اپنی جوان چھوکری کو ننگا کر کے بٹھا دیتی ہے۔۔۔۔۔ ”آہ، بیٹا۔ میری ثروت سے ملو۔ ثروت بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔“ اور پھر وہ قہنجی کی طرح چلتی ہوئی زبان اشاروں ہی اشاروں میں شرمیلی ثروت کی ریٹھی ساڑھی اور پتلا بلاؤز اتار کر رکھ دیتی ہے۔۔۔۔۔ یہ ثروت کی صراحی دار گردن ہے۔ یہ رہے ثروت کے مرمریں کستان۔ یہ ہے ثروت کی چکلی کمر۔۔۔۔۔ کوئی دل ہی دل میں بول دیتا ہے: شرمیلی ثروت ایک، شرمیلی ثروت دو، شرمیلی ثروت تین۔۔۔۔۔ قیمت ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار! گوراں بھی یونہی بکتی آئی ہے۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی نیلم ستار کو غش آ جائے۔ حاجی عثمان کی بھنویں تن جائیں گی۔ ڈاکٹر رحم کے ہونٹ بھیج جائیں گے اور غالباً انہیں وہ اُمید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے جب وہ انشورنس پالیسی بیچنے والوں کی طرح شادی کا بیمہ کر کے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو مکلف شہستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت، مجیدہ، زہرہ، خورشید، نجی، عفت۔۔۔۔۔ سب خوشگوار لڑکیاں ہیں۔ حسین ا بے حد حسین۔ ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جو نیلے نیلے آسمان کے درمیان جگمگا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے چکلیے جسم۔۔۔۔۔ او میرے خدایا! ان کے مہکتے ہوئے چکلیے جسموں میں چاند اور سورج اور کہکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کے رکھ دیا ہے۔ ان کی نشیلی اور بلند آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آئند پیام جھلکتے ہیں۔ لیکن ان کی تمتاؤں کی معراج مستقبل کے سامنے سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے ہوشربا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے چکیلی گاڑیاں۔ بھڑکیلے لباس۔۔۔۔۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوٰۃ نہ دے سکیں گی۔۔۔۔۔ میں نے ظمیر کی خوشامد کی، کہ دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے۔ خدا کے لئے اسے میرے پاس لے آؤ۔ دنیا کی ساری آبادی میں

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آگیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا کچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔ ”تم اپنے بالا خانے سے اپنی روزی کا سارا نہ لو، گوراں۔ کیا بچ بچ تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو مہینہ صرف اپنے لئے کما رہا ہوں؟

گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور نکھر گئیں۔ اس کا اُپر والا ایک دانت کھج سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر یکایک دو چار وحشی جھکوں کے ساتھ اس نے اپنی آخری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ پلک جھپکنے میں میرے سامنے گوراں نہ تھی۔ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت۔ مرمیں۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا۔ جھنجھٹا ہوا جسم۔۔۔۔

”تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔“ وہ میرے ساتھ پٹ کر مجھے دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگی۔ گوراں کی قیمت بیس کئے رات تھی۔ تم اُسے ساڑھے بارہ سو مہینہ پر چکا رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔“ اس کے لائبے لائبے سرخ ناخن کئی جگہ میرے جسم میں کھب گئے۔ ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی۔ میرے گلہ ان کو اٹھا کر زور سے بٹخ دیا۔ اپنی ساڑھی کے اُلجھے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹا۔ اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ جیسے دور سے جھلکنے والا روشنی کا جیہر سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔۔۔۔ گوراں کی سسکیوں میں لپٹی ہوئی ایک آواز رورہی تھی۔۔۔۔ ”تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوٹ لمحہ نہ دے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوٹ لمحہ نہ دے سکتے۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوٹ لمحہ نہ دے سکتے۔“

ہے جانے دو۔ وہ اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گذرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔۔۔۔ خرید نے دو۔ مجھے اس پر کوئی اختیار بھی تو نہیں۔۔۔۔۔

بایوس۔ عمدیدہ۔ بیزار۔۔۔۔ گوراں فٹ پاتھ پر ہوئے ہوئے جا رہی

ریاسدگی میں ہائے ہوز اور ہائے کھلی کا امتیاز ممکن نہیں ہے اس لئے جو قہوہ پینا چاہتے تھے، وہ قہوہ پیتے رہے۔ اور جو قہوے کی جگہ قہوے کے برتنوں سے دلچسپی لیتے تھے، وہ برتنوں سے دلچسپی لیتے رہے۔ دو رنگا بھی دلچسپیوں کا عادی تھا۔ لیکن ایک دن یکایک اس کے برتن لبالب بھر کے چھلک اٹھے، اور برص کے سفید داغوں کی طرح بار بار بھی اس کی زندگی کے ساتھ چپک کے لگ گئی۔

حادثات ہی تو ہیں!

دو رنگا

نام ضمیر، پیشہ انجینئری۔ لیکن عرفاً اسے دو رنگا کہتے تھے۔ اس نام سے اس کو چڑھتی۔ لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے منہ پر برص کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ گالوں پر، ماتھے پر، ہونٹوں پر، کانوں کے پاس، ٹھوڑی کے نیچے، گردن کے ارد گرد، آنکھوں کے پوٹوں پر۔۔۔۔۔۔ ہر جگہ سفیدی کے بڑے بڑے چوڑے چوڑے داغ تھے جن کے درمیان جا بجا اصلی جلد کے کالے کالے نشان بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔ جیسے سمندر کے جھاگ پر کونکوں کے ذرے تیر رہے ہوں۔

کچھ لوگ اُسے دھوپ چھاؤں کہتے تھے۔ لیکن یہ نام اس کے دفتر کے کلرکوں اور چپراسیوں تک ہی محدود تھا کیونکہ وہ اس کے مزاج میں دھوپ کی تیزی اور دسمبر کی کچپا دینے والی چھاؤں سے کافی واقف تھے۔

دورنگی جلد، دو رنگا مزاج، قسمت بھی اس کی زندگی کو ہر پہلو سے دوغلا بنانے میں مدد دے رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ لندن سے انجینئری کا امتحان پاس کر کے لوٹا، تو اپنے ساتھ ایک سفید فام بھورے بالوں والی چھوکری بھی لیتا آیا۔ باربرا ایسٹ اینڈ کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں برتن دھونے پر ملازم تھی۔ اس قہوہ خانے میں برتن دھونے والیوں کی تعداد برتنوں سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ تاہم لوگ وہاں جوق در جوق قہوہ پینے جاتے تھے۔ کچھ من چلے ہندوستانیوں نے اس جگہ کا نام فجبہ خانہ رکھ دیا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی بے

جب وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اسے اپنی سیاہ جلد کی یک رنگی اور پختگی پر ایک عجیب قسم کی کمتری کا احساس ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔ نیو ہوسٹل میں ایک لطیفہ تھا کہ دنیا کے مکمل ترین چاند گرہن کا حساب لگانا ہو تو کالج کے رجسٹر سے ضمیر کی تاریخ پیدائش نکال کے اس میں سے نو مہینے کے دن تفریق کر دو۔۔۔۔۔۔ مذاق ہی مذاق میں لڑکے اسے اپنے بستر کی سفید چادروں سے اٹھا دیتے تھے۔ پختہ رنگ ہے بھئی۔ پسینے کا ایک قطرہ بھی ٹپک گیا تو داغ پڑ جائے گا! وہ دل ہی دل میں اپنی کلاس کی زیب النساء سے محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی محبت کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک بار زیب النساء کے عتابی ہونٹوں کو چوم لے! وہ سادگی پسند اور قناعت شعار عاشق تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ محبت کو سرمایہ دارانہ لالچ کے زہر سے بے لوث رکھنا چاہیے۔ خوبصورت عورت چلتا پھرتا ثور ہے۔ وہ سب کی مشترکہ امانت ہے۔ اس کی ایک چھچھاتی ہوئی کرن زندگی کو سرشار کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ زیب النساء سے کہا کرتا تھا کہ تو دنیا بھر کے عاشقوں کی مساوی پونجی ہے۔ اس میں میری محبت کا حصہ صرف اتنا ہے کہ میں تیرے نازک اور خوں آشام ہونٹوں سے ایک چھوٹا سا لٹس چڑا لوں! زیب النساء نے کہا۔ ”بہت خوب مجھے منظور ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے یہ گارنٹی دیتے ہیں۔ کہ آپ کے ہونٹوں کا رنگ کچا نہیں ہے؟“۔۔۔۔۔۔

لندن پہنچ کر ضمیر کے ساتھ دو حادثے پیش آئے۔ ایک تو یہ کہ اس کی زندگی میں دورنگی علامات کا ظہور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے بڑے

دورنگے کے محکمے میں روپوں کی بھری ہوئی تھیلی اور چھوکری کے بھرے ہوئے جسم کے درمیان ترقی کے دروازوں کا کھل سم سم پوشیدہ تھا۔ ترقی کے دروازے ہی نہیں، روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے والے دونوں کا درویدار بھی ایک چھوکری کے کالے، پیلے، یا بھورے جسم پر قائم تھا۔ اگر کسی روز اس کی جیب یا گود خالی رہ جاتی تھی۔ تو آسمان سے آنے والی روزی کا اک سورج بند ہو جاتا تھا۔ ایک روز جب دورنگے۔۔۔۔۔۔ بدبو سے مکے ہوئے دورنگے۔۔۔۔۔۔ کی نوک قلم نے قاضی عبدالقدوس، روڈ محرر کے رزق پر بندش کی مر لگا دی، تو بچارے قاضی کو اپنی نمازیں اور اپنے روزے بے کار نظر آنے لگے۔ ان کی اُمیدوں کا آسرا خدائی مسند کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دال روٹی فرشتوں کے دوش پر آسمان سے اترتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور اب جو انہوں نے دیکھا کہ ایک بد صورت، گھناؤنا دورنگا انسان ان کے آب و دانے پر مطلق طور پر قادر ہے۔۔۔۔۔۔ تو انہوں نے منہ پھاڑ اپنے خدا کو ایک نقش گالی دی۔

ایک روز دورنگا باغیچے میں بیٹھا ہوا اوگھ رہا تھا یکایک کوٹھی کے صحن سے پہلے گالیاں اور پھر چیخیں سنائی دیں وہ بھاگ کر اندر گیا۔ اس کا خاناں جمال خاں کچن کے پاس پڑا چیخ رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر کوٹھی کا مہتر چیتے کی طرح سوار بیٹھا تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے پنجے جمال خاں کی گردن کو نوچ رہے تھے۔۔۔۔۔۔ ”سالا حرامی۔ ہماری مریا کو تاکتا ہے؟ خون پی لیں گے سالا حرامی کا۔۔۔۔۔۔“ صحن کے کونے میں ایک کالی کلونی، بھیگی سی عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ دورنگا ہنسنے لگا کہ یہ اُلو کا پٹھا مہتر آخر کس نعمت کے لئے یوں اکڑ رہا ہے۔ چڑیل ایسی صورت ہے حرامزادی کی۔ اس نے بڑھ کر مہتر کی پیٹھ پر کس کے ایک لات جمائی۔۔۔۔۔۔ شاید ایسے ہی کچھ شدید جھٹکے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی دورنگے کی چھاتی میں سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کر دیتے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے اپنی بار بار یاد آئی۔ وہ شاید اس وقت کمار

بہادر کے ڈریسنگ روم میں نیم برہنہ اپنا میک اپ کر رہی ہو گی۔ کمار چلیے دیوان پر لیٹا ہوا اسے ہر پہلو اور ہر زاویے سے جھانک رہا ہو گا۔ خیال ہی خیال میں ضمیر غصے سے بے تاب ہو کر کمار کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے اپنے تیز ناخنوں والی انگلیاں کمار کی پھولی ہوئی گردن میں گاڑ دیں۔ وہ زبان نکال کر جھکا کہ کمار کا گرم گرم خون چاٹ جائے۔۔۔۔۔۔ اور عین اس وقت کسی نے اس کی پیٹھ پر زور سے لات جمادی۔ یہ دو رنگا تھا۔ دو رنگا زور زور سے ہنسنے لگا۔۔۔۔۔۔ ذیم نان ہنس! اُس نے جمال خاں کے سینے پر چڑھے ہوئے مہتر پر دو چار لاتیں اور کس کس کے مار دیں۔ شکل تو دیکھو چڑیل کی جس کے لئے اکڑ رہا ہے سالا! اگر ضمیر میں کچھ ہمت ہوتی، تو وہ ضرور جواب دیتا کہ یہ سالا تو چڑیل کے لئے اکڑ رہا ہے لیکن تم اپنی پھول جیسی باربرا کے لئے کیوں نہیں اکڑ جاتے؟

آخر ایک دن دو رنگا بچ اکڑ گیا۔۔۔۔۔۔ باربرا کے لئے نہیں اپنی ملازمت کے لئے۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ چند روز سے ایک گھٹیا کمارا ہوا ساٹھ سالہ پاری بڑھا اس کے دفتر میں دخل در معقولات دینے لگا ہے۔ یہ مسٹریٹلی والا بھٹی کی کسی سینٹ کمپنی کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ رہا تھا۔ اب وہ کمار کی درخواست پر ریاست سورج نگر میں سینٹ کے کارخانے قائم کرنے آیا تھا۔ ریاست میں لائٹ سنون کوئی پہاڑی تو نہ تھی، لیکن مسٹریٹلی والا کے ساتھ اس کی جوان بیٹی ضرور تھی۔ مس باٹلی والا کے سینے پر بریلی چوٹیوں والے اُونچے اُونچے کسار تھے۔ ان مرمریں چٹانوں سے اول درجے کا سینٹ کریدنا کوئی پیچیدہ عمل نہ تھا۔ دو رنگا ریاست کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے اپنے ساتھ ایک خوشناریشم کاکیزا لیتا آیا تھا۔ مسٹریٹلی والائے کارخانوں کیلئے سینٹ کی پہاڑیاں اٹھا لایا تھا۔ رفتہ رفتہ شہوت کی ٹہنیوں کے سامنے مرمر کی چٹانیں سر اٹھا کے جم گئیں، اور ایک روز مسٹر ضمیر الدین جلالی خرابی صحت کی بنا پر استعفیٰ دیکر لنکا شائر کے سروہم میکفرسن کے کارخانوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے دہلی آ گئے۔

جلترنگ

صبح سے اس کے دوبار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا گیا ہو۔ سانس کی ہوا بھڑکتی ہوئی لالٹین کے دھوئیں کی طرح کثیف اور گھٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ تنگ آ کر ناک کو رومال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوئے پتے کی طرح چڑمڑانے لگتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ زور زور سے رو دینا چاہتا تھا۔ لیکن رونہ سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میٹرکولیشن کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلے کی لڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتا تھا۔ اب اس کے سامنے جسم چرا کر سمٹ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ جتنا ناپائی بھی اس کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر روزنامہ انقلاب زور زور سے پڑھ کر سناتے کو کہا کرتا تھا۔

جنا پہلوان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا اعزاز محلے میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا تھا۔ گلی کے نکل پر اس کا شور تھا جس کے ماتھے پر ”خوش لذیذ ہوٹل از طرف جمال دین پہلوان خادم قوم“ کا سائن بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا۔ اس کا نام تاج دین تھا۔ موقعہ و محل کے لحاظ سے جتنا پہلوان اسے خانساں، بٹلر، بوائے، تاجو، اور آٹو کی دم فاختہ کے مناسب القاب سے بلایا کرتا تھا۔ خوش لذیذ ہوٹل کے عقب میں ایک بوسیدہ چھجا تھا۔ جس

دہلی میں اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باربرا کو بجلی، پانی، بھاپ کے ایک خفیہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس کماری سے لیکر ہمالیہ پر بہت تک ہزاروں غلاظت کے ڈمیر ہیں۔ اور ان ڈمیروں میں لاکھوں کیڑے ریختے اور مرتے ہیں۔ وطن عزیز چھوڑنے کے بعد باربرا نے ایسے ہی کثافت کے گواروں کی نجات کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کیا فطرت کی مہربان طاقتیں بجلی، پانی، بھاپ کے اثر سے اس کا ہاتھ نہ بٹائیں گی؟

جٹو پہلوان کے منہ سے اپنے باپ کا ذکر سن کے خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی آگرے کے پچھتم میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ ابھی ڈیڑھ برس کا تھا۔ جب اس کے والدین ریل کے حادثے میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماموں نے اپنے زیر سایہ لے لیا تھا۔ ماموں تو تجارت کے لئے زیادہ عرصہ باہر رہتے تھے۔ لیکن ممائی نے خاصی توجہ سے اس کو پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ جہاں معاملہ خالد اور عزیزہ کے درمیان ہو، وہاں ممائی کا انصاف کھلم کھلا عزیزہ کا ساتھ دیتا تھا۔ عزیزہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد مجبوراً اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصے میں آکر اس کا منہ نوچ لیتی تھی، قلم توڑ دیتی تھی، کتاب پھاڑ دیتی تھی۔۔۔۔۔ اور اگر ممائی سے پٹتا

کوئی تیرا سا نہ ہوتا تھا جو اس کی چھاتی میں سن سے پیوست ہو جائے، شکاریوں کی چھریاں کند تھیں۔ ان کے دست و بازو لرزاں تھے۔ وہ شہر کی منڈیوں سے کٹا کٹایا گوشت خریدنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان میں یہ تاب کہاں تھی کہ وہ جنگل میں آہوئے وحشی خرام کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں!

فریدہ جوان اور خوبصورت ہی نہیں تھی۔ وہ جوانی اور خوبصورتی کے احساس سے لبریز تھی۔ لبالب بھرپور۔ شراب کی صراحی کی طرح، جسے ساقی کی انگلیوں کی ہلکی سی جنبش بے اختیار چھلکا کے رکھ دے۔ خوبصورت تو گلی کی اور لڑکیاں بھی تھیں۔ حمیدہ۔ صبوحی۔ جو تھیکا۔ سدامنی۔ لمبیدہ۔ کلثوم اور بیچ در بیچ آوارہ زلفوں والی ریحانہ جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمی رہتی تھی، اور گالوں پر سرے کے بنے ہوئے نقلی رل۔۔۔۔۔۔ وہ جوان بھی تھیں، لیکن انگریزوں میں سلگتے ہوئے نمدیدہ کوٹوں کی طرح، جنہیں پھونکیں مار مار کر دھکایا بھی جائے تو لمحہ بھر کو بھڑک کر پھر اندر ہی اندر سلگتے لگتے ہیں۔ فریدہ تو ایک شعلہ تھی۔ محض آگ یا انگارہ نہیں۔۔۔۔۔۔ ایک شعلہ، لپکتا ہوا، لہکتا ہوا، چھمکتا ہوا، جو اپنی تابانیوں کے لئے کسی سارے کامنت کش نہیں ہوتا۔ بلکہ فاسفورس کی طرح اپنے آپ بھڑک اٹھتا ہے۔ بچپن میں کوئی اسے بے چین بوٹی کہتا تھا کوئی کہتا تھا چنگاری ہے بابا چنگاری۔ آخر بڑھتے بڑھتے یہ چنگاری انگارہ ہوئی، اور جوان ہو کر شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ گھر کی ساری کھڑکیاں بند رہتی تھیں۔ دروازوں پر موٹی موٹی چھتیاں پڑی رہتی تھیں۔ اور پاسبانی کے لئے فریدہ کی ماں، فریدہ کی خالہ، فریدہ کی آپا نیپالی دربانوں کی طرح چوکس رہتی تھیں۔ لیکن نور ڈھانچے سے اتنا ہی پتتا ہے۔ ٹانگ شاہی اینٹوں کی ڈیڑھ فٹی دیواریں بھی فریدہ کو اپنی اوٹ میں چھپا کر رکھنے سے قاصر تھیں۔ ساز کے پاؤں میں تو بیڑیاں تھیں، لیکن سوز کا راستہ کون روکتا؟ گلی میں آنے جانے والے راہگیروں کو اچانک ایک غیر مرئی ایک ناقابل فہم سا احساس ہوتا تھا کہ اس گھر میں کچھ ہے۔ رنگ برنگی چوڑیوں کی ایک کھنک، دبے دبے قمقموں کی ایک

ڈاگی

فریدہ بدنام ہو گئی تھی۔ ڈاگی پر لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے، یہ بات نہیں کہ وہ گلی کوچے میں جوان چھوڑوں کے ساتھ آنکھیں لڑاتی تھی۔ نہ یہ کہ اندھیری رات میں اس کے چور دروازے کے آس پاس کوئی پڑا سرار یا منڈلایا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ بلکہ فریدہ تو محلے کے دل پھینک جوانوں کے لئے انگوروں کا گچھا تھی۔ جو پکے ہوئے رس سے چھلکنے کے باوجود بھی ترش تھے! بڑے بڑے بانگے ترچھے گہر و اس کے سامنے کئی کترا کر نکل جاتے تھے۔ فریدہ ان کے دل پہ راج کرتی تھی۔ لیکن وہ اپنی رانی کو پس پردہ پوجتے تھے۔ کھڑکیوں، دیواروں، اور چھتوں کی اوٹ میں بیٹھ کر وہ گھنٹوں فریدہ کے دیدار کا رس نگاہوں کے راستے چوستے رہتے تھے۔ چلمن کی آڑ میں فریدہ کی چوڑیوں کی ایک کھنک یا اس کی لرزتی ہوئی آواز کا ایک سر آس پاس کے جوانوں کی نس نس میں کڑکتی ہوئی بجلیاں چھوڑ دیتا تھا۔ فریدہ کے خیال ہی خیال سے ان کے خون میں آتشبازی کے آثار چھوٹے لگتے تھے۔ اور لذتِ احساس کے شدید جھٹکے نہیں ربڑ کی گیند کی طرح چپکا چپکا کر غڑھال کر دیتے تھے۔ لیکن اگر کبھی وہ کوٹھے کی منڈیر پر یا گلی کے کھڑپہ اچانک کسی کے سامنے آجاتی تھی، تو جو شیلے شکاریوں کی تنی ہوئی کمانیں ڈھیلی پڑ جاتی تھیں۔ انکے ترکش میں تیروں کی قطاریں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔ جنگلی ہرنی انکے سامنے کوڑے لگاتی گزر جاتی تھی۔ سانس پھلا کر اپنے سینے کا سارا ابھار شکاریوں کے نشانے پر آویزاں کر دیتی تھی۔ لیکن

ہوئے بڑی آپا کو شاید اپنا پیار خصم یاد آتا تھا جو ایک مرل سا بچہ اس کی جھولی میں ڈال کر سال بھر سے ہسپتال میں پڑا تھا۔

فریدہ سوچتی تھی، کہ خدا جانے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جو خواہ مخواہ پنچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ کیا وہ کسی سے اپنا خصم مانگتی تھی؟ کیا اس نے آج تک کسی کو اپنا خصم بتایا تھا؟ جو تمہیکا تو چوری چھپے ایک بچہ بھی پال رہی تھی۔ صبحی کا ایک ٹانگے والے سے یار نہ تھا۔ جو اسے سکول پہنچانے جایا کرتا تھا۔ اور بیچ در بیچ آوارہ زلفوں والی ریحانہ دودھ پیچنے والے چھو کرے کو باروچی خانے میں لے جاتی تھی جہاں دودھ لیتے لیتے اس کی زلفوں کے خم اور بھی ٹیڑھے ہو جاتے تھے اور اس کے گالوں پر سُرے کے بنے ہوئے نقلی تل مدھم پڑ جاتے تھے! فریدہ تو دن بھر گھر کے کام کاج میں جُستی رہتی تھی۔ وہ کمروں اور صحن میں جھاڑ دیتی تھی۔ کھانے پکانے کا سامان کرتی تھی۔ میلے کچلے کپڑوں کو دھوتی تھی۔ اور مٹانے میں اسے اگر کچھ ملتا تھا تو اماں کی گھریاں خالہ بی کی ڈانٹ، بڑی آپا کے طعنے۔۔۔۔۔۔ وہ تو چاہتی تھی کہ گھریاں کا کام سمیٹ کر جب اس کا انگ انگ ٹوٹنے لگے، اور وہ تھک ہار کر اپنی پلنگڑی پر کھٹ سے گر جائے، تو گداز گداز بانسوں کی آغوش اسے اپنی گرفت میں دیوچ لے، اور پیار بھری میٹھی میٹھی تھکیاں اس کے جسم میں چٹکنے والے انگاروں کو سکون کی نیند سلا دیں۔۔۔۔۔۔ لیکن اس سہانے خواب کی تعبیر آخر یہ نکل کہ ایک دن صحن میں شستائیاں بجنے لگیں۔ دالان میں براتیوں کا ہجوم ہو گیا۔ بچھوڑے میں ٹائی پلاؤ اور قورے کی دیکیں پکانے لگے اور شفقِ شام کے کھلتے کھلتے ماں، خالہ بی، اور بڑی آپا نے اپنی ناک کے صدقے ایک بھرپور جوانی کا جنازہ گھر سے نکال دیا۔ اور فریدہ بیگم عمر بھر کے لئے کلیم اللہ خان لولابی کے پلے باندھ دی گئی۔

کلیم اللہ خان لولابی کئی لحاظ سے خوش مزاج اور نیک چلن خاوند تھا۔ لیکن کالی کی طرح جو ٹھنڈے پانی کے سکون پر سوئی پڑی ہو! اس کے دماغ کا

جھنکار، رقصندہ قدموں کی ایک دھمک ناک شاہی اینٹوں کی پختہ دیواروں، ٹاٹ کے موٹے موٹے پردوں اور شیشم کے سنگلاخ دروازوں کا سینہ چیرتی ہوئی راہگیروں کے دامن پر برق سوزاں کی طرح جاگرتی تھی۔ ان کی کن بیٹیوں میں خون کا دباؤ تیز ہو جاتا تھا اور وہ دل کے پردوں میں کسی میٹھے احساس کا سرمایہ چھپائے تیز تیز گزر جاتے تھے۔ سامنے بالکنی میں گورے گالوں والی سدا منی اشاروں کی زبان سے پکار پکار کر دعوتِ نظارہ دیا کرتی تھی۔ فمیدہ جان بوجھ کر کھڑکی کی سلاخوں میں منہ ڈال کر اپنی لائی لائی گردن لٹکائے رہتی تھی۔ صبحی دروازے کی اوٹ سے گلی کی طرف تکتی رہتی تھی۔ جو تمہیکا ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد برآمدے میں بل بنانے آکھڑی ہوتی تھی۔ گزرنے والے انہیں دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ گھورنے والے انہیں گھور کر نکل جاتے تھے اور للچائی ہوئی نظروں کا یہ تصادم لمحہ بھر کے لئے دونوں طرف کی پیاسی جوانیوں پر ہلکی سی پھوار کر جاتا تھا۔ لیکن جو انوکھا احساس گزرنے والوں کو فریدہ کے گھر میں چھپی ہوئی ایک ان دیکھی، ان سنی، ان جانی کشش سے ہوتا تھا وہ نہ سدا منی کے گورے گالوں میں تھا نہ جو تمہیکا کی سرلی آنکھوں میں، نہ فمیدہ کی پچھلی گردن میں!

”ہائے ہائے ڈائن، آگ لگے تیری صورت کو۔“ فریدہ کی ماں ڈانٹا کرتی تھی۔ ”جب دیکھو آئینے کے سامنے دیدے مٹکاتی رہتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں تیرا خصم بیٹھا ہے شیشے کے اندر؟“

”نہ بابائے۔“ خالہ بی لقمہ دیتی تھی۔ ”جوان جہان بیٹیوں کو مٹ کر ہی جینا چاہئے۔ فریدہ دوپٹہ تو سنبھال نا مراد۔ یہ قبیض کے بٹن کہاں بھاگ رہے ہیں؟ چل سنبھل کے بیٹھ۔۔۔۔۔۔ کیا تو پ خانہ نکالے پھرتی ہے بے حیا۔“

فریدہ کی بڑی آپا ہاتھ نچا نچا کر طعنہ دیا کرتی تھی۔ ”بی بی دودن اور صبر سے کاٹ لو۔ پھر خصم ہی خصم ہے جیون میں۔ چار دن میں گرمی نہ نکل گئی تو کیا۔ صابن کے بلبلوں کی طرح جھاگ بیٹھ جائے گا ہاں۔۔۔۔۔۔“ اور یہ کہتے

جائے تو کیلے گھونٹوں کے سوا اور کچھ پتے نہ پڑے۔

فریدہ سہنوں کی ایک دنیا سے نکل کر آئی تھی، اور اب وہ سہنوں کی دوسری دنیا میں جا بسی۔ خوابوں کے ان دو جزیروں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ماں کے گھر میں جب وہ کام کاج سے تھک کر اپنے پٹنگ پر لیٹتی تھی، تو ان جالی آرزوں، ان کبھی اُمیدوں کے تصورات نیا نیا روپ بھر کر اس کی نیند میں گاتے اور ناچتے تھے۔ دن رات خصم خصم کے طعنے سن کر بھی وہ خواب میں چاندنی کی طرح غیر مرئی اور احساس کی طرح موہوم سایوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔۔۔۔۔۔ نئی نویلی دلہن کی طرح جو گھونگھٹ کا پٹ کھولتے ہوئے اس لئے جھجکتی ہو کہ شاید اس کے سامنے زمین نہ ہو، تاروں بھرا آسمان ہی آسمان ہو۔۔۔۔۔۔ اور ایک روز فریدہ سچ سچ کی دلہن بھی بنی۔ کماروں کی ڈولی نے اسے ایک پٹنگ سے اٹھا کر دوسرے پٹنگ پر لا ڈالا۔ پہلا پٹنگ سادہ تھا۔ دوسرے کے پائے رنگین تھے۔ لیکن ان پٹنگوں کے درمیان زندگی کا ایک عزیز سرمایہ لٹ کے رہ گیا تھا۔ ڈیڑھ دو سوہراتیوں نے اللہ اور رسول کو بیچ میں رکھ کے اُسے چمکے دیا تھا اور تبھی ہوئی راکھ کا ٹھنڈا بورا، اس کے پتے باندھ کر چلتے بنے۔ اب بڑی آپا کے ہاتھ نچا نچا کر دیئے ہوئے طعنے فریدہ پر منکشف ہونے لگے اور جیون میں خصم ہی خصم کا جوراگ وہ سنا کرتی تھی وہ کلیم اللہ خان لولابی کی عملی شکل میں اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔ سہنوں کی دنیا میں جو رنگ محل اس نے کھڑے کئے تھے، وہ ایک ایک کر کے مسمار ہونے لگے۔ اب اس کے خوابوں میں قوس قزح کے رنگوں کی جگہ اجڑے ہوئے سائے آنے لگے۔ مسرور جھولوں کی جگہ ہچکولے آنے لگے اور صوری خواہشوں کے ہچکولے۔ تشنہ آرزوں کے ناکام آسروں کے ہچکولے۔۔۔۔۔۔

اور پھر ایک دن اس کے خواب میں ڈاگی آیا۔ ڈاگی اس کا چیتا پلا تھا۔ وہ اپنی سنہری بالوں والی دم ہلاتا ہوا لپکا۔ اس نے اپنے اگلے پاؤں فریدہ کی گردن سے لٹکا دیئے۔ ڈاگی خرخر کرتا ہوا جھکا۔ اس کی نرم نرم گرم گرم زبان

رس بی۔ اسے کی ڈگری نے چوس لیا تھا۔ اس کے جسم کا رس پے درپے بے روزگاری گھول کر پی گئی تھی۔ اور اس کی جوانی کا رس اب ضلع کچہری کی کلر کی نچوڑ رہی تھی۔ جسم اور روح کی اس قربانی کے مدد سے اسے ہر مہینے ہستائیس روپے نقد تنخواہ کے مل جاتے تھے۔ ساڑھے پندرہ روپیہ مکان کا کرایہ۔ تین روپے کے جہاز مارکہ سگریٹ۔۔۔۔۔۔ ڈھائی روپیہ پان تمباکو۔۔۔۔۔۔ بیس روپے ہوٹل کھانے کے۔۔۔۔۔۔ اور باقی چند ٹکوں میں وہ کپڑے بھی خریدتا تھا، جوتے بھی کتابیں بھی، اخبار بھی، اور کبھی کبھی سستی شراب کا اڑھایا کسی سستی سی عورت کا اودگلتا ہوا رستا ہوا، کسماتا ہوا، ڈھیلا ڈھالا جسم۔۔۔۔۔۔ لیکن فریدہ کے آتے ہی اس کے بہت سے بل نکل گئے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی زندگی کا کُراب ہولے ہولے چھٹ رہا ہو۔ جیسے پالے کے مارے ہوئے، ٹھنڈے ہوئے بدن پر گرم گرم نرم نرم ریشمیں لحاف تان دیا جائے۔۔۔۔۔۔

کلر کی نے کلیم کو زندگی کے بہت سے ٹوکوں سے روشناس کر دیا تھا وہ جانتا تھا کہ تھکے ہوئے حاکم کے سامنے لمبے چوڑے پیچیدہ کاغذات لے جانے سے خاطر خواہ حکم لکھوایا جاسکتا ہے۔ دو چار سکوں کی روپلی جھنکار ایک اُدھکتی ہوئی، رستی ہوئی، کسماتی ہوئی عورت کے جسم کو برقائے رکھ دیتی ہے۔ سستی و سکی کا ایک آدھ جام دماغ کی پریشانیوں پر سکون کا پھلہا رکھ دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن جب جوا لاکھی کی طرح بھڑکتی ہوئی فریدہ اس کی جھولی میں ڈال دی گئی، تو اس کا دامن جل اٹھا۔ اگر فریدہ مسکراتی تھی، تو وہ اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں کے درمیان زور سے چوم لیتا تھا۔ اگر وہ گاتی تھی، تو وہ اس کے گلے کا نور نوک زبان سے چاٹ جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن کچھ ایسی بات تھی کہ فریدہ کے سامنے وہ ہمیشہ بے بس اور مجبور ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ پکے ہوئے آم کی طرح جس پر ذرا سا بوجھ پڑنے سے سٹھلی تو بیچ سے دور جا گرتی تھی۔ اور فریدہ کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا تو چھلکا، لچلچلا چھلکا جسے چوسا بھی

تین تارے

بال روم کا آرکسٹرا ایک نشیلی دھن بجا رہا تھا۔ نشیلے جوڑے مستانہ وار ناچ رہے تھے۔ میں نے جوز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا کہ اس نام میں ترنم،

فریدہ کی ٹھوڑی اور گردن کو زور زور سے چاٹنے لگی۔ ڈاگی کے وحشی پنچے فریدہ کے تن بدن میں پیوست ہو گئے۔۔۔۔۔ ایک بھونچال سا آیا۔ جیسے بہت سے آتش فشاں پہاڑ بھک سے پھٹ گئے ہوں۔ فریدہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے لائیں کی بتی کو اونچا کیا۔ ساتھ والے پنک پر کلیم سویا ہوا تھا۔ ہر خرائے کے ساتھ اس کے پیلے پیلے گال پھول جاتے تھے، جیسے کوئی شریر بچہ آم کے چُپے ہوئے چھلکے میں ہوا بھر رہا ہو! کمرے کے ایک کونے میں ڈاگی تھادہ ایک کھردرے سے ٹاٹ پر سانپ کی طرح کندلی مارے اونگھ رہا تھا فریدہ نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا پھر اس نے دبی زبان سے چُس چُس کر کے ڈاگی کو پکارا۔ ڈاگی نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ فریدہ نے ہاتھ پھیلا کر پھر پکارا ڈاگی دم ہلاتا ہوا اٹھا زبان نکال کے لپکا اور فریدہ نے اسے اپنی بانہوں کے درمیان دیوچ لیا!

دوسرے کے ساتھ کمرہ گئے۔ ہم نے اٹھ کر ایک دوسرے سے معافی مانگی۔ لیکن ہمارے دل یہی کہتے رہے کہ تم دونوں جھوٹے ہو۔ چور ہو۔ تم تو چاہتے تھے کہ وہ مختصر سا لمحہ غیر فانی ہو کر کائنات پر چھا جائے۔ اور اب تم معذرت کرتے ہو۔ جھوٹے مکار۔۔۔۔۔ اور اس جھوٹ کی سزا انجام کاریہ ملی کہ رانو کا ایک جگہ بیاہ ہو گیا۔ ہونا ہی تھا۔ لیکن ہمارے درمیان آرزوؤں کی جو ایک خوشنما ٹیکسلا سمار ہوئی تھی اسے ابھی تک کوئی کھود نہیں سکا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ککشاں کی پھلواری میں ایسے تارے بھی تو ہیں، جو صرف نظر آتے ہیں، ہاتھ نہیں آتے۔ لیکن نصرت کا وجود رانو اور جوز دونوں سے الگ ہے۔ وہ اس تارے کی طرح ہے جس کی روشنی ابھی زمین تک نہیں پہنچی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے آج تک نصرت کو نہیں دیکھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا اصلی نام شکست ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ بھی ہے، جہاں کہیں بھی ہے ایک لڑکی ہے۔ شاید وہ جوان ہو۔ شاید وہ خوبصورت ہو۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کون ہے اور کیسی ہے۔۔۔۔۔ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ وہ ہے اور ابد تک رہے گی۔ اسے ابد تک رہنا ہی چاہئے۔ مگر اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اُسے ابد تک رہنا ہی چاہئے مگر اس کے چاہے یا نہ چاہے سے کیا ہوتا ہے؟ اسے تو ابد تک رہنا ہی پڑے گا۔ وہ بنی نوع انسان کا عزیز سرمایہ ہے۔ وہ لٹ سکتی ہے۔ لٹا سکتی ہے۔ لیکن وہ مٹ نہیں سکتی۔ شاید وہ مٹا سکتی ہو، لیکن لالے کا داغ نہ آندھی نے مٹایا ہے نہ کالی گھٹاؤں نے۔ بھاری نصرت کی کیا بساط ہے۔۔۔۔۔ جب کہ اس کا نام ہی شکست ہو! کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ محض عورت ہے۔۔۔۔۔ یعنی مرد کی ایک آدھ حاجت روا کرنے والی بے ذائقہ سی دوا۔۔۔۔۔ جیسے قبض کے لئے کسٹرائل، یا کھانسی کے لئے جوشاندہ۔ کبھی خیال آتا ہے کہ شاید وہ عورت نہ ہو، محبوبہ ہو۔ ان دونوں بہنوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک آرزوؤں کو پورا کر کے مٹا دیتی ہے۔ دوسری تمناؤں کے ان مٹ جزیے آباد کیا کرتی

بن بن کر رقص کر رہے تھے۔۔۔۔۔

رانو کی آنکھوں میں ایک جھنکار سی آگئی۔ اور وہ کمرے کے گانے کے ساتھ ساز کی طرح آویزاں ہو گئیں۔ جب کمرے کو انعام کا تمغہ ملا تو میں نے ہولے سے زبول کہا۔ کہ اس کی اصلی حقدار تو رانو ہے!

”جی؟ وہ چونکی۔ ”لیکن میں نے گانا تو نہیں گایا۔“

”موسیقی صرف آواز ہی میں نہیں ہوتی!“ میں نے اس کی رقصندہ آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شرما گئی۔ رانو کی آنکھوں کی پلکوں میں میرے لئے ایک دنیا سی آباد ہو گئی تھی۔ زمین اور آسمان کی ہر چیز پر کنول کے پھول کھلے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن اس نئی دنیا کے وجود پر ہمیشہ ایک کمراسا چھایا رہا۔ ایک خاموش غبار سا جیسے کسی رنگ محل کے اُونچے اُونچے کلس بادلوں کے اوٹ میں چھپے ہوئے ہوں۔ کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے کبھی رانو سے یہ نہ کہا کہ اس کی آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میں نے کبھی اس کو یہ نہ بتایا کہ اسکی گھنی پلکوں کے سائے میں ایک ننھی سی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ ہم دونوں سمندر کی لہروں کی طرح ایک ہی ساحل کی طرف جارہے تھے۔ وہ مجھے ایک بار بھی نہ بتا سکی کہ ہمارے دل کی دھڑکنوں نے چوری چوری ایک چھوٹا سا آشیانہ بنا لیا تھا۔۔۔۔۔ ہم وقت کے پردے میں خاموش دھماکے سنتے رہے۔ دو برس تک ہم ایک دنیا میں رہے لیکن متوازی خطوط کی طرح الگ الگ۔۔۔۔۔ ایک ہی کشتی میں سوار، لیکن دریا کے کناروں کی طرح جدا جدا۔ ہر روز ہم ملتے تھے۔ کبھی کلب میں۔ کبھی سینما میں۔ کبھی گھر میں۔ کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔۔۔۔۔ اور گھنٹوں ہم کھیلتے تھے۔ کبھی پنگ پانگ۔ کبھی ٹینس۔ کبھی تاش۔ کبھی کیرم۔۔۔۔۔ ایک روز ٹینس کھیلتے کھیلتے اس کے پاؤں میں موج آگئی۔ مجھ سے یہ بھی نہ ہوا کہ اسے سہارا دے کر کرسی تک لے جاؤں۔ کلب کے دوہروں نے اسے اٹھا کر کوچ پر لٹا دیا اور پھر ایک روز تاش کھیلتے کھیلتے میز کے نیچے اچانک ہمارے پاؤں ایک

ہے۔ لیکن منزل تو دونوں کی ایک ہے۔ عورت یا تو خود تھک ہار کر چلنگ پر جاگرتی ہے، ورنہ اسے چونٹی سے پکڑ کر گرایا جاتا ہے۔ لیکن محبوبہ کی مسافت ناز کے سمارے طے ہوتی ہے۔ وہ تمناؤں کی کشتی میں سوار ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کے ہچکلے اُسے جھولا بٹلاتے ہیں۔ لیکن اس کے رومانوں کی پرواز بھی اپنی رواستی پنگلزی کے پاس جا کے ختم ہو جاتی ہے۔----- میرا خیال ہے کہ نصرت عورت بھی نہیں، محبوبہ بھی نہیں، محض نصرت ہے۔ یعنی جس کا نام ٹکست ہونا چاہئے تھا۔ میں تصور ہی تصور میں اپنے دیرانوں کو نصرت سے آباد کر لیتا ہوں۔ ایک معمولی سی، آوارہ سی غمیدہ لڑکی۔ جسے اپنے پاس بٹھا کے یہی جی چاہے کہ صرف باتیں ہی کئے جاو۔ غم کی باتیں الم کی باتیں۔ ٹکست کی باتیں۔ فلسفہ نہ سسی۔ ادب نہ سسی۔----- نہ تقصے ہوں۔ نہ راز ہو۔ نہ نیاز ہو۔----- فقط نصرت ہو۔ اور اس کی باتیں۔ جب اس نے پہلی بار محبت کی۔ جب اسکی محبت کے آبگینے پہلی بار چُور ہوئے۔ جب اس نے دوسری بار محبت کی۔ جب اس کی محبت کے آبگینے دوسری بار چُور ہوئے۔ جب اس نے تیسری بار۔----- لیکن میں بہک رہا ہوں میں باتوں ہی باتوں نصرت کے چھپائے ہوئے راز فاش کر رہا ہوں۔ شاید نصرت مجھے کبھی معاف نہ کرے گی۔-----

لیکن نصرت تم جانتی ہو، میں بالکل بے ریا ہوں۔ مجھے نہ عورت کی تمنا ہے، نہ محبوبہ کی۔ میں تو نصرت کو چاہتا ہوں، خواہ وہ ٹکست ہی کیوں نہ ہو۔----- جو گوشت اور پوست کی خواہشوں سے بے نیاز ہو کر کسی کو اپنا سکے۔----- بہن کی طرح۔ ماں کی طرح ساتھی کی طرح۔----- لیکن عورت کی طرح نہیں۔ محبوبہ کی طرح نہیں۔----- بلکہ ٹکست کی طرح!

پہلی تنخواہ

تین سونٹوے روپے پندرہ آنے۔۔۔۔۔ ایک آنہ رسید کے ٹکٹ کا کٹ گیا۔ ورنہ پورے چار سو ہوتے۔ رویش نے نوٹوں کا پلندا سنبھال کر جیب میں ڈالا، اور خزانچی کے زمین دوز سلام کا جواب گردن کی ایک رعونت آمیز جنبش سے دے کر خزانے سے باہر نکل آیا۔ اس کے دل میں رسید کا ایک آنہ کٹ جانے کا درد تھا۔ ورنہ اس کی جیب میں اب تین سونٹوے روپے پندرہ آنے کی جگہ پورے چار سو روپے ہوتے۔ کل چار سو روپے، اور دنیا بھر کا خرچ۔ آف! یہ سرکار بھی کیا مضحکہ خیز حرکتیں کرتی ہے۔ میرے دستخطوں پر ایک پورے دفتر کا کام چلتا ہے۔ لیکن جب تنخواہ کے چار سو روپوں کی بات ہو تو ایک آنہ رسید کا ضرور کٹے گا۔۔۔۔۔ چہ، رویش نے غصے سے خزانے کے چپراسی کی طرف دیکھا۔ جو پھانک کے پاس کھڑا اسے جھک جھک کر سلام کر رہا تھا۔ جیسے بخشش کی ایک چوٹی پر اس کا پیدائشی حق ہے۔ لوگوں نے بھی کیا کیا واہیات رواج بنا رکھے ہیں۔ بیکار۔ فضول۔ جیسے وہ اُلٹا کاٹھا کوئی تنخواہ ہی نہیں پاتا۔ یہی بخشش تو رشوت کا پہلا سبق ہے۔۔۔۔۔ بچ گیا شیطان۔ اگر منہ سے کچھ مانگتا، تو رپورٹ ہو جاتی سالے کی۔۔۔۔۔

راستہ بھر رو میش مسکراتا رہا۔ ہنستے کھیلتے چہرے، بھڑکیلی دکانیں، چمکیے لباس۔۔۔۔۔۔ زندگی میں مسرت کی چاندنی، خوشی کی لہریں۔۔۔۔۔۔ واہ! کیا کہنا۔۔۔۔۔۔ جب وہ اپنے نئے فرنیچر گول کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے لگا تو

”حضور، اس خط پر ٹکٹ کم ہے۔ ڈاکیہ ایک آنہ مانگتا ہے۔“ رویش کے نوکر نے ایک بوتھل سالفاہ لا کر دیا رویش نے دستخط پہچان کر خط کو ہاتھ میں تولیا۔ اس کے کندھے بیزار کن تھکاوٹ سے سکڑ گئے۔ اونہ، پنشن پانے کے بعد پتاجی تو بالکل رستکار ہو گئے۔ لیکن انہیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ بچا رہنا نیا نیا ملازم ہوا ہے۔ اسے اتنے لمبے چوڑے خط پڑھنے کی فرصت کہاں؟ ان کی

بلے-----

ننھی بلانے اپنی زندگی کا پہلا خط لکھا تھا۔ عبارت میں بچپن کی معصومیت بھی تھی، اور ایک چھوٹی بہن کا تھکسانہ انداز بھی۔ بلا کی فرمائشیں بہت بڑی نہ تھیں وہ پہلی تنخواہ کی اہمیت کو نہ سمجھتی تھی۔ اس لئے مندر کا چڑھاوا، قیموں کی مدد، براہمنوں کا بھوجن اس کے لئے کچھ معنی نہ رکھتے تھے۔ زندگی کے پہلے آٹھ سالوں نے ابھی اسے جمپر جارجٹ اور رُوج کی کشش سے بھی آگاہ نہ کیا تھا۔ اسے انگریزی کا نیا قاعدہ چاہیے۔ ایک اچھا سا جزدان۔ سیاہ رنگ کے چمکدار بوٹ۔ کچھ مٹھائیاں۔۔۔۔۔۔ اور یہاں تک آکر اس کی ضروریات کا تخیل پورا ہو جاتا تھا۔

رومیش پر ایک وجدانی سرور سا چھا گیا۔ اس کے دل میں پیار کی ہلکی ہلکی گدگدیاں ہونے لگیں۔۔۔۔۔۔ بلانے کس محنت سے یہ خط لکھا ہو گا۔ لکھتے وقت وہ زبان ہونٹوں میں دبا کر کاغذ پر جھکتی ہوئی۔ اور پھر اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے قلم کو یوں خوبصورتی سے گھماتی ہوگی، جیسے ایک باکمال مصوّر اپنا رنگین شاہکار بنا رہا ہو!

انگریزی کا قاعدہ، اچھا سا جزدان، سیاہ رنگ کے چمکدار بوٹ، کچھ مٹھائیاں۔۔۔۔۔۔ رومیش دل ہی دل میں ان ننھی ننھی فرمائشوں پر مسکرا رہا تھا۔ دنیا میں ہر کسی کا تخیل اپنی ذات کے گرد منڈلاتا ہے! ماما جی یہاں آنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ لیکن کیا اچھا ہو، اگر ان کی جگہ چپا۔۔۔۔۔۔ یعنی شانتا اور چپا دونوں آجائیں! اور پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تین سو نٹاوے روپے پندرہ آنے۔۔۔۔۔۔ مہینہ بھر کا خرچ۔۔۔۔۔۔ ننھی بلا کی فرمائشیں بھی کتنی ننھی ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن بچوں کی تربیت میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہیں ہوش سنبھالتے ہی دوسروں سے مانگنا سکھایا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔

رومیش نے ایک بار پھر اپنے ویران کمرے پر اچھتی سی نگاہ ڈالی۔ اور وہ خلا جو آج یکایک وہاں پیدا ہو گیا تھا اُسے اور بھی بے تاب کرنے لگا۔ سامنے ٹیبل صاحب کی کوٹھی تھی۔ باغیچے میں رنگارنگ کے پھول لہلہا رہے تھے ننھی

جانا۔ بھپروں کے نمونے بھیج دیئے تھے۔ جارجٹ کا رنگ بستی کی جگہ گلابی ہو تو اچھا ہے۔ یوں تو آسانی رنگ بھی برا نہیں۔ اگر ہو سکے تو دونوں بھیج دیں۔ شلواریوں کی سلک احتیاط سے خریدیں۔ سفید ہو تو سب سے بہتر، ورنہ ہلکا شربتی رنگ اچھا رہے گا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ جاتے ہی یا ڈلے کا رُوج اور لپ سنک بھیج دوں گا۔ میرے پاس تو اب پاؤڈر تک نہیں رہا۔ یہاں پر کسی دکان میں فیسرین نہیں ملتی۔ پتا جی بازار سے کچھ ہینڈ بیگ دکھانے کے لئے لائے تھے۔ مجھے کوئی بھی پسند نہیں آیا۔ جیسے مھنٹس کے چڑے کے بنے ہوئے ہوں! آپ کو کرا کوڈا کل لیدر کا ہلکا سارینی ٹی بیگ مل سکے، تو خرید رکھیں۔۔۔۔۔۔ آج کل میری ایک سیلی یہاں آئی ہوئی ہے۔ آپ کو شاید چھپا یاد ہوگی۔ کانپور کے رائے صاحب گلاب مل کی بیٹی جس کے ساتھ ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے اس نے اس سال انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا ہے۔

۔۔۔۔۔۔ اگر آپ اس کے لئے کوئی اچھی سی چیز بھیج دیں، تو وہ بہت خوش ہوگی۔“

شانتا اور اس کی فرمائشیں! رومیش نے سوچا، وہ روز بروز کتنی آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ جب دیکھو بناؤ سنگار کا بھوت سر پر سوار ہے۔ جمپر، جارجٹ، رُوج، لپ سنک۔۔۔۔۔۔ کم بخت ماما جی کی مثال سے بھی سبق نہیں لیتی۔ وہ اپنی سادگی میں کس قدر خوش ہیں۔ ان کی زندگی کیا بے فکری سے گزرتی ہے۔۔۔۔۔۔ خوب! چپانے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی دے دیا ہے! اب تو بڑی ہو گئی ہوگی۔۔۔۔۔۔ اور یہ شانتا ابھی تک انٹرنس میں لٹکی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ کس قدر شوخ ہوا کرتی تھی چپا! اب اس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی دے دیا ہے! چپا! نام کچھ کچھ چنبیلی کے وزن پر ہے۔۔۔۔۔۔ جیسے کلیاں! مسکراتی ہوئی کلیاں! میں اسے ضرور ایک تحفہ بھیجوں گا۔۔۔۔۔۔ چمکتا ہوا سنگاروان؟ کالے اور پیلے اور نیلے بلاؤز؟ مرمر کا کیوپڈ؟۔۔۔۔۔۔

رومیش نے چوتھا کاغذ نکالا، تو اسے دستخط پہچاننے میں دقت ہوئی۔

کھلا مالی کی قینچی ہاتھ میں لئے پودوں کو قطع دیرید کر رہی تھی۔ رویش کو کھڑکی میں دیکھ کر وہ مسکرائی، اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ادب سے سلام کیا۔

----- رویش کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب کی طرف اٹھا اور نوٹوں کے پلندے کے پاس جا کر رک گیا۔-----
اوہ! اس نے سوچا، کھلا کس قدر بڑھ گئی ہے! ابھی کل تو بچہ نظر آتی تھی۔----- اے کاش! آج پھر وہ میرے پاس سگترے کے بیج مانگنے آئے۔-----

رویش کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے ویران ماحول سے فرار ہو کر اور کہیں نہیں تو پکھری کے کمرے میں چلا جائے۔ اور عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مقدموں، مسلوں اور فیصلوں میں کھو جائے۔----- شاید آج وہاں پھر وہ بڑھیا آئے جس کا بیٹا چوری کے الزام میں حوالات میں بند تھا۔ شاید اس کے ساتھ اس کی بہو بھی ہو۔----- وہ نوجوان، شرمائی ہوئی غم دیدہ لڑکی جو اس روز تنہا رویش کی کوٹھی پر اپنے پتی کو چھڑانے آئی تھی۔ جب وہ زبان سے رحم کی زکوٰۃ نہ پاسکی، تو غالباً رشوت کے طور پر اس نے اپنا گھونگھٹ الٹ دیا! ایک برق نما چہرہ اس کے دامن پر تڑپ کے گرا۔ وہ دم بھر کے لئے دو تیرتی ہوئی سیلاب زدہ آنکھوں میں ڈوب گیا۔----- آہ، یہ قوف رویش! آج سے چند روز پہلے وہ ایک جذباتی گدھا تھا۔ انصاف! اصول! سچائی! اخلاق!-----
اونہ دنیا نے بھی کیا کیا ڈھونگ بنا رکھے ہیں۔ اس روز وہ خوبصورت لڑکی مایوس ہو کر لوٹ گئی۔ اے کاش، ایک بار پھر وہ اپنا پتی جیل سے چھڑانے آئے۔ صرف ایک بار۔-----

رویش نے بے تاب ہو کر کھڑکی بند کر دی۔ اور کمرے کی بے کیف خاموشی سے گھبرا کر باغیچے میں آگیا۔ سامنے مالن مرغیوں کو دانے بکھیر رہی تھی۔ اس کی سیاہ رنگت میں پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور وہ اپنے موٹے موٹے، بھتے سے ہونٹ پھلا کر مرغیوں سے کچھ مہمل سی باتیں کر رہی

تھی۔ رویش ذرا زور سے کھانسا اور نوٹوں کا پلندا جیب سے نکال کر ہوا میں اچھالنے لگا۔----- مالن نے نظر اٹھا کر غور سے دیکھا، جھک کر سلام کیا، اور مرغیوں کو اپنے آگے لگا کر دوسری طرف چلی گئی۔----- غوں۔-----
غوں۔----- غاں۔----- مالن مرغیوں سے اسی طرح پیار کرتی جا رہی تھی۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔----- کوئی بھی نہیں۔----- رویش نے سوچا، اس مطلب پرست دنیا میں کوئی بھی کسی کی پروا نہیں کرتا۔----- اور پھر سارا زور لگا کر اس نے نوکر کو پکارا۔

”چندو، وہاٹ ہارس کی ایک بوتل۔----- انگریزی شراب کی دکان سے۔----- فوراً۔-----“

چندو اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ جیسے اسے پتھو نے ڈس لیا ہو۔ فرط حیرت سے اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔
”تم جاتے کیوں نہیں؟“ رویش کڑک کر بولا۔ ”میری طرف گھور کیا رہے ہو۔----- حرامزادے۔-----“

صبح صادق کے جھپٹے میں چندو نے سنگار میز پر حجامت کا سامان لگا کے رکھ دیا۔ رویش ایک صوفے پر اونڈھا پڑا تھا۔ سامنے تپائی پر وہاٹ ہارس کی خالی بوتل تھی۔ احمری پردوں سے چھن چھن کر آنے والی چند مدھم سی شعاعیں کمرے میں تھر تھرا رہی تھیں۔ ننھی، بدلا کا خط صوفے کے پاس گرا پڑا تھا۔ اور اس کے قریب رویش کی پہلی تنخواہ۔-----

صنم ہلکیٹ کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک دھیمسا نغمہ ناچ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی تان سوئی ہوئی ندی کے پُر سکون گیت کی طرح ہوا میں منتشر ہو کر گم ہو جاتی تھی۔ معبد بیوس میں ابھی تک روشنی نظر آرہی تھی۔ اس کے بند دروازوں سے موسم بہار کی ننھی ننھی پھوار کی طرح، پجاری کی پُرسوز، لرزتی ہوئی آواز پھوٹ کر فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ صنم ہلکیٹ نے ایک لمحہ ساکت کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے، اور پھر معبد کے ساتھ والے حجرے میں چلی گئی۔ حجرے میں ایک مدھم سادیا ہو لے ہو لے دم توڑ رہا تھا۔ معبد بیوس کے بوڑھے پجاری کی رفیقہ حیات، کلرانگ ڈولما دو تین ندے ادڑھے مدہوش سو رہی تھی۔ صنم ہلکیٹ نے بجھتے ہوئے چراغ میں

کے دل کو جنسی محبت کے آتشیں جذبات سے خالی رکھتا ہے۔ اس عمر کے بعد جب بڑھتی ہوئی دوشیزہ کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تیز ہونے لگتی ہے، اور اس کی رگوں کا خون تازہ حرارتوں سے گرمانے لگتا ہے۔ تو ایک لطیف رات، جبکہ چودھویں کا چاند سوئی ہوئی امنگوں کو جگاتا ہے، خداوند لھا کسی تمثیلی خواب کے ذریعے اس کی جوانی کی لہروں کو متلاطم کر دیتا ہے۔ نودمیدہ دوشیزہ کے لئے یہ ساگ کی پہلی رات ہوتی ہے۔ کیونکہ اس شب، خداوند لھا کے حکم سے، وہ خواب میں کسی فوق الفطرت روحانی طاقت کی عروس بنتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن صنم ہلکیٹ کا خواب سن کر بوڑھی کلرانگ ڈولا کچھ افسردہ ہو گئی۔ کیونکہ صنم ہلکیٹ کے خواب میں جو دولھا آسمان سے اُترا، وہ مضطرب لہروں کی طرح کوئی ضیاپاش تجلی نہ تھی۔ بلکہ ایک حسین، بیحد حسین، نوجوان تھا۔ جس کا کشادہ سینہ گرتی ہوئی آبشار کی شفاف آبی چادر کی طرح خوبصورت تھا جس کی پیشانی چودھویں کے چاند سے بھی پُر نور تھی۔ صنم ہلکیٹ کے شرمائے ہوئے گالوں پر اس نوجوان نے گرم گرم بوسوں کا مینہ برسایا۔ اور پھر اس کی لہراتی ہوئی چوٹی کو اپنی گردن میں ڈال کر ناچنے لگا۔۔۔۔۔ لیکن جب بادلوں کے فرش پر، بجلی کے تاروں سے بنی ہوئی عروسی سچ عشق بیتاب کو حسن کی سکوں پر در چاندنی میں سلانے والی تھی۔ تو آہ! وہ دلربا نوجوان ہلکیٹ کے پہلو سے غائب ہو گیا۔۔۔۔۔ ”ماں، جس طرح چاند کی کرن بادلوں میں کھو جائے۔۔۔۔۔ مقدس ماں! جیسے پانی کی لہر چل کر مٹ جائے، اور۔۔۔۔۔ اور پھر نہ ملے۔“

کلرانگ ڈولما دونوں ہاتھوں سے اپنا کپکپاتا ہوا سر تھامے متحیرانہ سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔ کمرے کا چراغ پھر اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔۔۔۔۔ اور صنم ہلکیٹ کے لمبے لمبے بے قرار سانس میں لپٹی ہوئی ایک دھیمی سی آواز کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ ”معبد ہیوس کی اچھی ماں! یہ میٹھی میٹھی خلش کیا ہے؟ جس طرح ننھی ننھی بوندیں تلااب میں گر کر بلبلوں کی ہلکی ہلکی لہرس بناتی ہیں۔۔۔۔۔

”تمہارے پہلو میں“----- اور عامل وہاں سے بھاگ گیا۔

شینو گرافر

یہ شاید اس کا پہلا شعر تھا۔

”میرے سپنوں کے باغ میں دبے پاؤں کون آیا؟ مالی! اسے تھام لے!
وہ میرے شبنم کے موتی چرا رہا ہے!“

ٹائپ کئے ہوئے کانفوز کے پلندے میں شاید وہ اپنا پرائیویٹ نوٹ
پپر رکھ کے بھول گئی تھی۔ میں نے میز کی گھنٹی بجا کر اسے بلایا۔
”دیکھو گر لسی، یہ شاید تمہارا کانفوز ہے۔“

”نہیں سر“ وہ جھپٹی، اور پھر اس کا گلا بھر آیا۔ جیسے میں نے اس کی
ٹائپنگ میں ہزاروں غلطیاں پکڑ لی ہوں۔ ”سوری سر۔ میری بھول سے دوسرے
کانفوز میں چلا آیا ہے۔“

”جب تمہاری غزل پوری ہو جائے مس، تو مجھے دکھانا!“ میں نے مذاقاً
کہا۔

اس نے ٹرے کی فائلوں کو اکٹھا کیا اور جلدی سے نکل گئی۔
اس روز شاید وہ سارا دن اپنی مکمل ہونے والی غزل میں کھوئی رہی۔
صبح صبح میں نے کئی ضروری سرکلر لکھائے تھے۔ وہ شام تک ٹائپ کر کے نہ
لائی۔

میں نے بلا کر پوچھا ”سب کانفوز ضروری ہیں مس۔ ابھی ختم نہیں
ہوئے؟“

”----- یہ سب ضد ہے“ وہ اپنا کانپٹا ہوا سر ہلا کر پڑا سرار لہجے میں کہا کرتی
تھی۔----- ”سب ضد کا نتیجہ----- ہی ہی ہی----- خداوند لہا سے
ضد! جب تک روحانی نوجوان نے ضد کی کہ وہ صنم ہلکیت کے حسن کو ہمیشہ
ہمیشہ کیلئے اپنا کر لے، اس وقت تک وہ اپنی محبوبہ کے پہلو میں تشنہ کام و تشنہ
روح تڑپتا رہا۔----- ہی ہی ہی----- اور جب صنم ہلکیت نے ضد کی کہ
اس کے پہلو والا خوبصورت جوان اسے مل جائے، تو وہ پتھر بن گئی، اور روحانی
جوان انسان بن گیا۔----- ضد؟ بیوقوف لڑکی----- مجھے معلوم تھا۔-----
معبود ہیوس میں جلنے والے چراغ کے کھن کی قسم----- آسمان سے ضد؟

”سوری سر۔ میں فوراً آتی ہوں“ اس کے لیے میں التجا تھی۔
”اور غزل؟“ میں نے طعنہ دیا۔

میرا خیال ہے، میرے اس طرز سے اس کے دل پر چر کا سا لگا۔ غالباً وہ اس اچانک چوٹ کے لئے تیار نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چہرہ اسی ساری ٹائپ شدہ فائلیں لے آیا۔

عموماً مجھے اس بھولی سی لڑکی پر ترس آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تیر کی طرح سیدھی اور بے مل تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سکول کا نیلا فرائم پہن کر دفتر آیا کرتی تھی۔ اب تک اس میں کلاس روم کی عادتوں کا پرتو تھا۔ سکول کی لڑکیوں میں جو المیہ سی بے باکی ہوتی ہے، گریسی میں ابھی اس کو فائلوں کے اہبار نے پائمال نہیں کیا تھا۔ ایک دن لکھاتے لکھاتے میں نے گرامر کی غلطی کی۔ گریسی نے ٹوک دیا۔

”دونوں طرح ٹھیک ہے“ میں نے اپنی پوزیشن کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھا!

”نہیں، سر۔ نیلسن کی ہائی سکول گرامر میں اسے غلط ٹھہرایا گیا ہے“
میں نے ہار مان لی۔ مجھے تلاش کے باوجود بھی اس کے ٹائپ کئے ہوئے پلندوں میں املا کی غلطی نہ ملتی تھی۔ اگر وہ سکول چھوڑنے سے پہلے سینئر کیمرج کا امتحان پاس کر لیتی، تو شاید دفتر میں اسے اگلا گریڈ مل جاتا۔

جب وہ کانفڈنس کے ڈھیر میں ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھتی تھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ایک سنجیدہ سے بچے کو زبردستی بزرگوں کے کپڑے پہنا دیئے ہوں وہ بولتی بہت کم تھی۔ میں نے دو چار دفعہ اتفاقاً اسے ہنستے دیکھا تھا۔ ایک بار اس وقت جب کچھ لکھاتے لکھاتے میری پنسل میز سے پھسل کر نیچے جا پڑی، میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر کئی بار اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ پھر میں نے گھنٹی بجاکر چہرہ اسی کو بلایا۔ اس نے پنسل اٹھا دی۔ گریسی بے اختیار ہنس پڑی۔

”کیا بات ہے مس؟ میں نے پوچھا۔

کچھ نہیں سر۔ مجھے کنگ برڈس اور مکڑی کا قبضہ یاد آ گیا تھا“
چوٹ برجستہ تھی۔ لیکن مجھے زیادہ نہ بھائی۔ شاید گریسی کو بھی میرے تیور برے لگے۔ لیکن یہ میرا قیاس ہی قیاس ہے۔ کیونکہ اس کا گول گول چہرہ اسٹیج کی طرح تھا جس میں جذبات کے پرنالے بھی ہوں تو نشان چھوڑے بغیر جذب ہو جائیں۔

دوسری بار جب میں نے اسے ہنستے دیکھا تو نازک موقع تھا۔ اس روز دفتر کی ایک لیڈی اسسٹنٹ مس مارگرٹ نے دو ماہ کی چھٹی کے لئے درخواست بھیجی تھی۔ کلرکوں میں کاناپھوسی ہو رہی تھی، اور وہ اپنے سکشن کی ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف کن انکھوں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ لڑکیاں جھوٹ موٹ ٹائپ کی مشینوں پر انگلیاں مار کے ایک بھڑا سا ترنم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مارگرٹ کی افسوسناک مجبور یوں پر زہر لب تبصرہ ہو رہا تھا۔ گریسی نہ مسکراہٹوں میں شامل تھی، نہ چہ میگوئیوں میں۔ وہ حسب معمول کانفڈنس کا پلندہ لئے کھٹ کھٹ ٹائپ کر رہی تھی۔

”بدمعاش!“ دفتر کے ہیڈ اسسٹنٹ امیش بابو نے مارگرٹ کی درخواست پر سفارشی نوٹ لکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اینگلو انڈین چھوکر یاں آگا چچھا تو دیکھتی نہیں، اور پھر دو مہینے کی چھٹی مانگتی ہیں۔ دفتر نہ ہو، باوا کا گھر ہو۔ کس نے کہا تھا کہ سالے ٹامیوں کے ساتھ رات دن رکشا میں گھوما کرو۔ امیش بابو نے قلم کان میں گھما کر کچھ ایسی ادا سے کہا۔ جیسے ٹامیوں کی بجائے اگر مارگرٹ اس کے ساتھ رکشا میں گھومتی، تو گویا محفوظ تھی۔

پھر امیش بابو نے کھیانی پٹی کی طرح کن انکھوں سے گریسی کی طرف دیکھا اور آواز میں لوج پیدا کر کے بولے۔ ”مس گریسی، تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر مارگرٹ کے لئے صرف ایک مہینہ کی چھٹی کی سفارش کردوں تو کام چل جائے گا؟“

بورڈ کے صدر نے کوآلی فیکیشن والا سوال دہرایا۔

”سر شارٹ پنڈ اور ٹائپ کرنا جانتی ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

”اور؟“ بورڈ کے ایک ممبر نے کرید۔

”سر، شارٹ پنڈ میں میری رفتار بہت تیز نہیں۔ لیکن میں مشق کر

رہی ہوں

”اور کچھ؟“ دوسرے ممبر نے زور دیا۔

”سر، آپ کو شاید شیو گرافر کی ضرورت ہے“ گرہسی نے یاد دلایا۔

تراخ!----- انٹرویو بورڈ کے ممبر گویا ایک دھماکے کے ساتھ پیانو،

اور ناچ، اور گانے کی محفل سے دفتر کے کمرے میں آگرے! معاً انہیں یہ محسوس ہوا، اس چھوٹی سی لڑکی نے ان سب کے کان کھینچ دیئے ہیں۔ انکی بزرگی اور عظمت کو ایک پوشیدہ سا جھٹکا لگا۔ لیکن شاید مجبور ہو کر انہوں نے گرہسی کو رکھ لیا۔

جب گانے اور ناچنے اور تیرنے والی لڑکیوں نے دیکھا کہ ایک نئی سی نیلے فرائڈ والی چھوڑی ان پر بازی لے گئی ہے، تو ان کی گردنوں کے لوچ نکل گئے ہونٹوں کی گلابی پتیاں بدنما طور پر بکھر گئیں اور انہوں نے ناک سکیڑ کر سوچا۔ آج یہ بورڈ کے ممبر کیا پہچانیں، بوڑھے، کھوسٹ-----

جب وہ پہلے روز دفتر میں آئی، تو امیش بابو سب سے اول چیل کی طرح اس پر جھپٹے۔ جس طرح ہر نئی چھٹی کے اوپر والے بائیں کونے پر ان کا چھوٹا سا دستخط ہونا ضروری تھا، اسی طرح ہر نئی ٹائپسٹ لڑکی پر سب سے پہلے جھپٹنا وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس پستالیس سال کی مستقل گردش میں ان کے اگلے دو دانت اور سر کے بہت سے بال گر گئے تھے۔ لیکن ان کا ایمان تھا۔ کہ ریٹائر ہونے میں آٹھ دس برس باقی ہیں۔ جب سرکار کو خود ان کی جسمانی اور دماغی حالت پر عمل بھروسہ ہے، تو ان سالی چھوڑیوں کے ناک بھوں چڑھانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو رشوت اور عورت ایک برابر ہیں-----

گرہسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹ کھٹ کھٹ----- ٹائپ مشین چل رہی تھی۔

”مغزور ہے سالی“ امیش بابو چل کر بولے۔ پھر انہوں نے ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ”دیکھ لوں گا جب سالی خود اپنی درخواست بھیجے گی“

لڑکیوں نے امیش بابو کی خوشامد کے طور پر ہلکے ہلکے قہقہے لگائے۔ گرہسی کا منہ تھمتھا گیا۔ اس نے دھک سے ٹائپ مشین پر سے دھکیل دی۔ اور اپنی فائلوں کا پلندا اٹھا کر ککڑے ککڑے کر ڈالا۔ دفعتاً کمرے میں سکوت چھا گیا۔ کنفیڈنشل فائلوں کے ککڑے دیکھ کر سارے کلرک سہم سے گئے۔ امیش بابو کان میں قلم گھماتے میرے کمرے میں آئے۔ میں نے گرہسی کو بلا کر پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”سنو ری سر۔ مجھے غصہ آگیا تھا“

غصہ! مجھے اس کی آزاد سادگی پر بہت ہنس آئی۔ امیش بابو کھسیانے ہو گئے۔ اگلے روز میں نے کئی کلرکوں کو دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دیا۔

جس روز شیو گرافر کی اسامی کے لئے انٹرویو ہونا تھا۔ بہت سی لڑکیاں امیدوار تھیں۔ قریباً سب نے اپنے چہروں کو خاص اہتمام سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ ان کی ساڑھیوں اور گاؤنوں میں سلیقے کے بل تھے، جن کے سہارے کمر اور سینے کے خطوط والہانہ طور پر عیاں ہو رہے تھے۔ گرہسی نے فقط اپنے سکول کا نیلا فرائڈ پہنا ہوا تھا۔ اور اس نے ابھی سینئر کیمبرج کا امتحان پاس نہ کیا تھا۔

انٹرویو کے وقت لڑکیاں زبان کی جگہ آنکھوں سے جواب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہر سوال پر انکے ہونٹوں کی گلابی پتیاں ایک لطیف سی مسکراہٹ کو شگفتہ کرتیں، ان کی گردنوں میں ہلکے ہلکے خم اٹھتے، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں کو اکٹھا کر کے بولنے کی جگہ گانے کی کوشش کرتیں۔ کسی کو پیانوں میں مہارت تھی۔ کوئی مشاق ڈانسر تھی۔ ایک نے موسیقی کے تمنغے جیتے تھے۔ دوسری تیرنا بہت خوب جانتی تھی۔ جب گرہسی کی باری آئی تو

اور یہ اینگلو اینڈین لڑکیاں تو ہاتھ کا میل ہیں، ہاتھ کا میل----- چلتی کا نام گاڑی ہے بھائی، روپیہ ہو، تو سب حلال ہے۔ چنانچہ بابو امیش چندر ہر سینے اپنی بالائی آمدنی کا ایک حصہ اس ہاتھ کے میل کے لئے اٹھا رکھتے تھے----- یوں بھی ان کے ہاتھ میں زنجیر کے دونوں سرے تھے۔ اگر ان کی چلتی ہوئی گاڑی کو ذرا سا ہچکولا بھی لگے، تو لڑکیوں کی ترقی کے پروانے امیش بابو کی لوسہ کی الماری سے گم ہو جاتے تھے۔ انکی چھٹی کی درخواستیں درازوں میں پڑی پڑی گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ اور ان کی تنخواہوں کے بل میں غیر حاضریوں کے سرخ سرخ نشان نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن اب شاید عمر میں پہلی بار امیش بابو کو محسوس ہوا کہ ان کی گاڑی کے پینے کے سامنے ایک بڑا سا روڑا آ پڑا ہے اس لئے وہ گریسی سے زیادہ خوش نہ تھے۔ وہ جب ان کے سامنے آتی۔ تو ان کے منہ کے بائیں گوشے سے پان کی پیک نادانستہ طور پر بنے لگتی۔ اور ان کے مصنوعی دانتوں کا جڑا انگوڑوں کی ترشی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگتا۔

دفتر نہ ہوا، سالا راہب خانہ ہوا!----- امیش بابو عموماً جھلایا کرتے تھے۔ گریسی کے آنے سے ٹائپنگ سیکشن پر سنجیدگی کا موٹا سالخاف گر جاتا تھا۔ جس طرح آدمی رات کے وقت کسی رقص گاہ میں گرجے کا پادری ہاتھ میں انجیل اٹھائے آکھڑا ہو-----! اس کی زندگی میں ایک سادہ سی، ساکن سی یکسانیت تھی۔ جیسے کلاک کی سونیاں ۱۲ سے ۱۲ تک ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہیں۔ کلاک کی سونیاں کہنا بھی غلط ہے، کیونکہ ان کے مدھم مدھم جھکوں میں تو زندگی کے پراسرار لمبے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ گریسی تو شاید ایک معمولی سی چادر تھی، جسے ہر صبح دھوپ میں سکھانے کے لئے کھڑکی پر ڈال دیا جائے----- اور وہ شام تک لٹکی رہے----- دفتر میں جو اور ٹائپسٹ لڑکیاں تھیں----- ان کی زندگی میں رنگین چور دروازوں کے کھلے ہوئے پٹ تھے، خفیہ کھڑکیاں تھیں، چھپے ہوئے روزن تھے، لیکن گریسی گویا ایک تاریک قبر میں رہتی تھی۔ کہ جس کے راستوں کو بڑی بڑی ریلیں رکھ کر مسدود

کر دیا ہو۔ دن کے ایک بجے جب لچ کے لئے گھنٹے بھر کی رخصت ہوتی، تو ریفرشمنٹ روم کی بلوری میزوں کے گرد ایک ایک شمع اور کئی کئی پروانے جمع ہو جاتے۔ امیش چندر اور ان کے ہم خیال بابو اس موقع پر اپنے ہاتھ کا میل شامی کبابوں، مرغ مسلم اور بیڑ کی رنگین بوتلوں کی شکل میں اتار بھیکتے تھے۔ جب ٹائپسٹ لڑکیاں، اور لیڈی کلرکیں واپس لوٹیں، تو ان کی آنکھوں کے پونے بھاری بھاری ہو کر گرنے لگتے اور بیڑ کا خمار لوریاں بن کر انہیں تھکنے لگتا۔ امیش بابو کو بھی اس وقت گریسی کے ٹائپ رائٹر پر غصہ آتا تھا کیونکہ اس کی ہلک اس ماحول کی خاموش موسیقی میں مانوس گڑ گڑائیں پیدا کرتی تھی۔ گریسی کی میز کی دراز میں ایک چھوٹا سا پیکٹ پڑا رہتا تھا جس میں وہ اپنے لچ کے لئے چار چھوٹے سے سینڈ ویج بانڈھ لایا کرتی تھی۔ جب شام کے پانچ بجتے تو وہ بچی ہوئی فائلوں کا بنڈل اٹھا کر سائیکل پر جا بیٹھتی تھی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھر چھوڑ آؤں۔ لیکن کچھ بات تھی، کہ میری ہمت نہ بندھی جب دوسری لڑکیاں دفتر کے دروازے میں نمودار ہوتی تھیں تو مشتاقانہ یار کا غول ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ کچھ خاکی وردیوں والے ہوتے تھے، کچھ کمپنیوں اور دفاتروں میں کام کرنے والے اینگلو اینڈین چھوکرے! کبھی کبھی ہوٹلوں کے گانڈ اور رقص گاہوں کے دلال بھی اپنا پھندا اٹھائے پہنچ جاتے تھے۔ کسی لڑکی کو رکشا میں جگہ ملتی، کوئی وکٹوریہ میں سوار ہو جاتی، کسی کے لئے ٹیکسی منتظر ہوتی----- اور پھر ان کی شام کا آغاز فریوز میں چائے کے ساتھ ہوتا۔ لائٹ ہاؤس میں سینما گریٹ ایڈیشن میں ڈنر، ڈانس، اور وکی کے چچھاتے ہوئے پیکیج جذبات کا انگارے۔ آگ۔ دھواں اور رات کے پراسرار سائے----- لیکن گریسی کی زندگی میں تو ایک سائیکل تھا۔ جس پر سوار ہو کر وہ تیز تیز چورگی سے گزر جاتی۔ نیومارکیٹ سے چاکلیٹ یا ٹینی کا ایک پیکٹ خریدتی۔ اور پھر گوراجند روڈ پر اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی جاتی۔ اس کی زندگی کا سرمایہ جارج تھا----- ایک چھوٹا بھائی، جسے قدرت کی

ستم ظریفیوں نے گریسی کی امانت میں دیدیا تھا۔ جب جارج بھل میں کتابوں کا بچہ اٹھائے سکول سے لوٹا۔ تو گریسی کے لئے گویا زندگی کا ایک نیا دن طلوع ہوتا تھا۔ وہ نسخی سی لڑکی اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ جارج کے قدموں میں بچھا دیتی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ساری کائنات سمیٹ کر جارج کی جھولی میں ڈال دیتی۔ گریسی کے ذہن میں اپنے بچپن کے دھندلے سے عکس تیرتے رہتے تھے۔ اس کا باپ کلکتہ کی ایک اسٹیر کمپنی میں ملازم تھا۔ گریسی کو محض اتنا سایا یاد تھا کہ عام طور پر آدمی رات گئے ایک بدست اور مخمور باپ شراب کے نشے میں چور گھر میں آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ گریسی کی ماں کو بھل میں لیکریوں جھنجھوڑنے لگتا جیسے بھوکا کتا ہڈیاں چجوڑ رہا ہو۔ لیکن عموماً وہ آتے ہی غصے سے بے تاب ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں شرارے سے چھوٹنے لگتے، اور وہ شور بے اور گوشت کی ہلیشوں کو اندھا دھند بھاری بیوی کے سر پر دے مارتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے گریسی کو بھی پٹا تھا۔ یونہی، بلا وجہ۔ اور گریسی کو اب تک یاد تھا کہ اس کا باپ کئی بار عجیب سی لڑکیوں کو گھر میں لے آتا تھا۔ پہلی پہلی دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد گالوں پر سرخی اور پاؤں کے بد نما دھبے، بکھرے ہوئے بال، بانسوں پر ابھری ہوئی نیلی نیلی رگیں۔۔۔۔۔ ایک دفعہ ایک ایسی ہی سُرُخ بالوں والی بد صورت سی لڑکی کئی روز ان کے گھر میں ٹھہری۔ اور جب جانے لگی، گریسی کے باپ نے گھر کے کپڑے، برتن اور زیور اٹھا کے ٹیکسی میں ڈال دیئے، اور اس سُرُخ بالوں والی لڑکی کے بازو میں بازو ڈال کر چلا گیا۔ پندرہ برس سے گریسی کی ماں اُمید کا چراغ جلائے بیٹھی تھی کہ شاید کسی روز آدمی رات گئے ایک بدست شرابی گھر میں آئے اور اس کی ہڈیاں چجوڑ کر رکھ دے۔ اس بھاری کا سر ہلیشوں کی چوٹ سینے کے لئے ترس گیا۔ لیکن جو ٹیکسی جا چکی تھی، وہ واپس نہ آئی۔ جانے والا اس کی جھولی میں گریسی اور جارج دو نشانیاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہسپتال میں نرس بن گئی، اور پندرہ برس تک اس نے اپنی دونوں امانتوں کو سنبھالا۔ ایک دن جب وہ ہسپتال سے نکلی، تو

ایک گذرتی ہوئی ٹرام نے اچانک اُسے کچل دیا۔ اس کا سر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، لیکن اس کے ہاتھ میں ابھی تک چاکولیٹ کے دو پیکٹ تھے، جو وہ ہر شام گریسی اور جارج کے لئے خرید کر لے جایا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔ خدا جانے وہ کونسا اذلی انصاف تھا جس نے یکایک گریسی کو سکول کے کمرے سے نوچ کر دفتر کی میز پر لا بٹھایا۔ وہ ابھی بچہ تھی۔ لیکن جارج کی خاطر اس نے اپنی زندگی کی شاہراہوں کو سمیٹ کر بند کر لیا۔ دفتر سے آتے ہوئے وہ ہر روز جارج کے لئے چاکلیٹ یا ٹافی کا بنڈل لایا کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے سکول کے چند فراک تھے۔ لیکن جارج کے لئے وہ ہر فیشن کے کپڑے سلوا یا کرتی تھی۔ اتوار کے اتوار وہ اسے پک تک پر لے جاتی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے وہ سینما چلے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ملازم نہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں گھر سنبھالتی تھی۔ رات کے وقت جارج اس سے پریوں اور جنوں اور سمندری ڈاکوؤں کی کہانیاں سنتا تھا۔ اور پھر گریسی دفتر کی بچی ہوئی فائلیں ٹائپ کرنے بیٹھ جاتی۔۔۔۔۔۔ زندگی کی اس انتھک گردش میں شاید ایسے لمحے بھی ہوتے تھے، جو اس چھوٹی سی لڑکی کے دل میں سپنوں کے باغ کھلا دیتے تھے، اور وہ کسی دبے پاؤں آنے والے چور سے شبنم کے موتی چھپالیتی تھی۔

گریسی اب بھی سینیو گرافر ہے۔ لیکن اب اس کے پاس بہت سے بھڑکیے فراک ہیں۔ شام کے وقت وہ سائیکل پر گھر نہیں جاتی۔۔۔۔۔۔ اسے بھی رکشا میں جگہ ملتی ہے یا وکٹوریہ میں یا کسی شاندار ٹیکسی میں۔ اور اب اس کی زندگی میں بھی فریوز کی چائے ہے۔ لائٹ ہاؤس سینما۔ گریٹ ایسٹرن میں ڈنر۔ ڈانس و سکی کے چچھاتے ہوئے پیکیج۔ جذبات کے انگارے۔ آگ۔ دھواں اور رات کے پڑا سرار سائے۔۔۔۔۔۔ جارج بھی سیاہ ہو گیا ہے۔ وہ آدمی آدمی رات گئے نشے میں چور گھر آتا ہے۔ اور غصے سے بے تاب ہو کر شور بے اور گوشت کی پلیٹیں گریسی کے سر پر دے مارتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ کوئی دھنسی ہوئی آنکھوں والی لڑکی بھی ہوتی ہے۔ پیلے پیلے گل۔ نیلی

”سر۔ میں کمزور نہیں ہوں۔ لیکن میرے دل میں ایک نامعلوم سا خوف سلایا جا رہا ہے۔ سر، مجھے نہیں معلوم کہ میرا دل اس قدر ڈوب کیوں رہا ہے۔۔۔۔۔۔“ وہ اس سے ہوئے بچے کی طرح میرے قریب کھسکتی آ رہی تھی، جسے ایک گہری اور تاریک کھائی کے سرے پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو۔۔۔۔۔۔

جب گاڑی چلنے لگی، تو میں نے پہلی بار اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔ گریسی نے میرا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی پلکوں میں دو گرم گرم آنسو مچلے، اور تڑپ کر میرے ہاتھ پر گر پڑے۔۔۔۔۔۔ دو جلتے ہوئے انگارے جو ازل تک اپنے خاموش داغ چھوڑ گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ گریسی کے سپنوں کے خواب بھی اجڑ گئے، اس کے جہنم کے موتی بھی لٹ گئے، وہ جیتے جی مر بھی گئی۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کے دو غیر فانی موتیوں کو کون چھیڑ سکتا ہے، جو میرے دائیں ہاتھ کی رگ رگ میں پیوستہ ہیں؟



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

رگیں الجھے ہوئے بل۔۔۔۔۔۔ گریسی کے دل میں ہم ایک زہرناک خدشہ لرزتا ہے کہ شاید وہ کسی روز ایک سُرخ بالوں والی لڑکی کے ساتھ عیسیٰ میں بیٹھ کر چلا جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کی ساری لڑیاں جمع کر کے روپوں کے جال بنتی رہتی ہے۔ تاکہ جارج اڑ نہ جائے۔ جارج کو روپیہ چاہیے۔ شراب کے لئے روپیہ۔ سیر کے لئے روپیہ شکار کے لئے روپیہ۔ سُرخ بالوں والی بھدی بھدی لڑکیوں کے لئے روپیہ۔۔۔۔۔۔ گریسی اس کا ہاتھ خالی نہیں رہنے دیتی۔ وہ روپیہ لاتی ہے۔ وہ روپیہ کماتی ہے۔ وہ روپیہ چراتی ہے۔۔۔۔۔۔ دفتر کی تنخواہ سے، صاحب کے تحفوں سے، امیش بابو کے ہاتھ کے میل سے، فرپوز سے، لائٹ ہاؤس سے، گریٹ ایسٹرن ہوٹل سے۔۔۔۔۔۔

مجھے معلوم نہیں زندگی کی اس سکون پرور آبشار میں یہ جوار بھٹا کیسے آیا۔ برسوں سے وہاں میرا تبادلہ ہو چکا تھا۔ چارج دینے سے پہلے میں نے نئے صاحب کو دفتر کے عملے سے ملایا۔ جب گریسی کی باری آئی، تو انہوں نے چپکے سے میرا ہاتھ اپنی طرف بھینچا، اور زبردستی لب گنگنائے۔۔۔۔۔۔ گڈ لارڈ پناخہ ہے، بھی پناخہ۔“ اس وقت میرے دل میں دفعتاً یہ خواہش ابھری، کہ کاش دفتر کی چھت پر ایک زبردست بم کا گولہ پھٹ جائے۔۔۔۔۔۔ جب میں ریل گاڑی میں سوار ہوا، تو دفتر کا سارا شاف الوداع کہنے آیا ہوا تھا ان میں گریسی نہ تھی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں ضرور میرا احترام ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن جب گاڑی اگلے اسٹیشن پر جاڑکی، تو میں نے دیکھا کہ وہ پلیٹ فارم پر پھولوں کی چھوٹی سی ٹوکری اٹھائے کھڑی ہے۔ جب اس نے پھولوں کا گلہ ستھمے دیا، تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں ننھے ننھے خندوں کا طوفان سا اُٹا ہوا تھا۔ وہ بار بار کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میرا بازو تھام لیتی تھی۔ میں نے اُسے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک چھوٹا سا لکچر دیا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح تھمر تھماٹھے، جیسے آندھی کے تھیمڑوں نے انہیں اچانک جھنجھوڑ دیا ہو۔